سیرۃ النبی
علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی مکمل اور مستند و مقبولِ عام سوانحِ حیات

سیرۃ النبی ﷺ

جلد چہارم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نام کتاب ——— سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مصنف ——— علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی
تاریخ طباعت ——— صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
تعداد ——— ایک ہزار
پریس ——— آر۔ زیڈ پیکجز، لاہور

فہرست مضامین

سیرت النبیؐ جلد چہارم

★

دیباچہ طبع اول

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ ؛

اے باز کن درِ معانی — بر ما بکلید آسمانی
ہر چہ از تو گمان برم بہ کونی — آن من بوم و تو زآن برونی
شاہِ رسل و شفیعِ مرسل — خورشید پسین و نورِ اول
سلطانِ ممالکِ رسالت — طغرائے صحیفۂ جلالت (خسرو)

پیشِ نظر کتاب "سیرت النبیؐ" کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے۔ اس کا موضوع منصب نبوت ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی واخلاقی وروحانی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی واخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں شرح وبسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کے تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیشگاہِ باری سے جو شریعت کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا، وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات۔ خیال تھا کہ عقائد وعبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق ومعاملات دوسری جلد میں ہوں، مگر جیوں جیوں مسافرِ قلم اس دشوار گزار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا، دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت، فرائضِ چہارگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق ومعاملات ہوگا، جس میں ہم اس کی تفصیل بتائیں گے کہ تمدن ومعاشرت بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوقِ نساء، غلامی، جہاد، اصول حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے، پھر موازنہ کرکے ہم دکھ[illegible] اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی شریعت کا پایۂ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورہ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں، مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ وترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے، اس لئے ان صفحات کو ان کے نام نامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں، بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ

کوشش ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام وتعلیم کی پوری تشریح استناد واستدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کی جائے، قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیشِ نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے موازنہ کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی تکمیل شان نمایاں ہو جائے۔

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی علم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے اس سے منا کر کسی دوسرے علم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ اکمل تر تعلیمات دینے کے ہیں بلکہ انہی تکمیل کرنے والے کے ہیں مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس ارتقا و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور جیسا کہ خود اسکا دعویٰ ہے اور اس دعوے میں کوئی اور دین اسکا شریک نہیں ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي۔

انہی تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور انکی بحث کتنی نازک ہے اس لئے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گزرجانا کس قدر مشکل ہے، تاہم میں نے جد و جہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کروں چلنے والا تو تھک کر چور ہے اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقے کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدون اور مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں، اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو دی تھی، چنانچہ ان اوراق میں انہی چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى میں مذکور ہیں یعنی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان، چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اس لئے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوندا میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنا، اور ہم کو سیدھی راہ دکھا۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ (اعراف ۲۲)	جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔
وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ (زمر)	اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (بقرہ)	ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرما۔
ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد	توقیع قبول روزیش باد

طالب رحمت
سلیمان ندوی
۲۵ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ
(دار المصنفین اعظم گڑھ)

دیباچہ طبع ثانی

سیرت النبیؐ جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول و عقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں، میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی، لیکن الحمد للہ والمنۃ کہ سوائے دوزخ کی ابدیت وغیرابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علماء اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین و آفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کر دوں کہ ملأ اعلیٰ کی خوشنودی و رضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شاملِ حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جارہی ہے اس میں طبع اول کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے کہیں کہیں عبارت کی خوبی و شستگی کے لئے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیتِ نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔ واعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اول چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لئے ۶۱۶ صفحوں کی ایک جلد بننے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لئے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۵۰۴ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کر دی گئی ہے تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کر لے تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۷ رجب ۱۳۵۳ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

منصبِ نبوت

کتاب کا موضوع، آپ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں، بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا، اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پُرزور کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا، اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی، اور چاہا کہ اس جماعت کو بزورِ شمشیر مٹا دیں، اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پُرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو مسلسل دس سال تک قائم رہا، رفتہ رفتہ اعجازِ نبوت، حسنِ تدبیر، لطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہوتے اور پھر ایک پُر امن نظام قائم ہو گیا، بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجبِ منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذاتِ اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا، وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز، اور کرشمۂ ربانی کا پورا مظہر ہے، تاہم وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی براہِ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں، جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے، آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ کی سیرتِ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں، یعنی عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور آخری شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور سرور و محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدۂ عالم کو سراج منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاقِ فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی ازسرِ نو آبادی، الغرض خاتم النبیین کا اصلی کام ایک شریعتِ ابدی کی تاسیس، مذاہبِ عالم کی اصلاح، فنِ اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانونِ الٰہی کا اظہار و عرض اور تہذیبِ نفوس کی معراج اخیر تھی، اور یہ سب اسی پُر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے، پیشِ نظر جلد آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے ان ہی واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں، جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی و محنت اور متواتر جدوجہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعر مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں، جن کو حکیم کہتے ہیں، اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے، نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس[1] اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے، یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ، نقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں اس لئے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق و مشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔

امام صاحب فرماتے ہیں:۔

"نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے، سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام۔۱۵)

اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ۔۵)

اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا، لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سوجھائیں۔

اس موقع کے لئے صریح آیت یہ ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ[2] (جمعہ۔۱)

یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے اسے دے۔

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں، نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں

---

[1] معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے [2] امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے میں نے اپنی طرف سے آیت پوری لکھ دی ہے۔

اسی طرح نوعِ انبیاء کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاضِ عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے، مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لئے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نبوت، نوعِ انبیاء کے لئے اکتسابی چیز نہیں، لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبولِ وحی کی استعداد اور تیاری کے لئے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغازِ وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کی، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلہ اس طرح گزارا کہ وہ مادی دنیاوی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہِ طور پر روزہ کی حالت میں رہے، اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غارِ حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے حرا میں جا کر عبادت میں مشغول ہوئے تو رویائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی، وحی کے بعد بھی آپ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے، اسی لئے قرآن نے آپ کو خطاب کر کے کہا۔

طٰهٰ، مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى (طٰہٰ-۱) (اے پیغمبر!) ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لئے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسنِ صورت، اعتدالِ مزاج، نشو و نما کی پاکی، حسنِ تربیت، طہارتِ نسب، کرمِ اخلاق، نیک طینتی، متانت، سنجیدگی، دوستانِ الٰہی کے ساتھ نرم جوئی اور تواضع اور دشمنانِ حق کے ساتھ شدت و قوت پائی جاتی، علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار، تمام برائیوں سے پاک، فضائل و محاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریاد خواہوں کی فریادرسی، اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے، اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (نجم-۱) تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہ روی سے پاک ہوتا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (نجم-۱) اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قومیں اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً و کرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں، بایں ہمہ وہ مغرور، جابر، جفا پیشہ، بدخو اور درشت مزاج نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

2

نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں، ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی، اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفس ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی، جس کے بل پر انسان، حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنے نفوس قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے، وہ اپنے ان قدسی نفوس و پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہِ راست سوجھاتے اور خود راہِ راست پر قائم رہتے ہیں، ان کی پیغمبرانہ عقل و فہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح پیغمبروں کے عجیب و غریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔

اور اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی، اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (کہف ۱۲۰) میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق و امتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں، فکری، قولی، عملی۔ ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں، پہلے دو احتمال بداہۃً غلط ہیں، اب رہ گیا تیسرا احتمال، یعنی بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ ہے فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے، جس شخص کو خالقِ فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحبِ شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ نوعِ انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے نہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہو سکے، اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے انسان کو اس کیلئے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تعاون کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ

بُرے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں اس کو تمانع کہتے ہیں، اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے اور رہنے کے سامان واسباب فراہم کرتا ہے تعاون کے ذریعہ نکاح وقرابت اولاد واعزہ اور احباب ودوست کے حقوق وتعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی، اور ان کی دولت وجائیداد اور عزت وآبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس تعاون اور تمانع کے اصول ضرور ہے کہ مرتب محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں، جن میں کسی شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو، بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الٰہی سے بن سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص یا کسی خاص خاندان قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا، ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لئے یکساں واجب العمل ہو محال ہے اس لئے ضرور ہے کہ یہ اصول اسی کی طرف سے وحی ہوں، جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال وکیفیات کے رموز سے باخبر ہے، یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا، اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی، پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا، نیست سے ہست کرنا)، اور امر (جو موجود ہست ہے اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات ان ہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق، اور مخلوق کے درمیان خلق وایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں، اسی طرح پیغمبر، خدا اور بندوں کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق ومخلوق کے درمیان ایجاد وپیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں۔

(۱) چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لئے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لئے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے، یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

(۲) ہر قسم کے حرکات کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو دمبدم حرکت کی تجدید کرتا رہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لئے ضرور ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے، اسی طرح طبعی حرکت کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب وماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم ان کو حرکت دینے کے لئے کسی عاقل ومدبر کی ضرورت ہے اسی لئے قرآن نے ان کے لئے کہا۔

وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حٰم السجدہ) — خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا

(۳) اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آسکتیں، اسی طرح ان حرکات کو ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال وحرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

(۴) خدا کے حکم دو قسم کے ہیں، تدبیری اور تکلیفی، پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے، جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے۔

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف)

اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔

تکلیفی حکم صرف انسان کے لئے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ (بقرہ۔۲۰)

اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔

مقدمات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں، اسی لئے مرجح کی ضرورت ہے، اختیاری ہیں، اس لئے عقل کی ضرورت ہے، خیر و شر کے محتمل ہیں، اس لئے رہنما کی ضرورت ہے، اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے، اسی قیاس پر انسانوں میں خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسے ہی نفوس قدسیہ کے ذریعہ سے ہوگا، اور ان ہی کا نام پیغمبر ہے

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بہیمی اور ملکوتی، کھانا، پینا، شہوت، حرص و طمع، استیلا و جبر وغیرہ، افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں، اور غور و فکر، علم و معرفت، حسن اخلاق، صبر و شکر، عبادت و طاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں، انسان کی روحانی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت، اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو، اگرچہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ و عصیان کے نقصانات ظاہر ہوں، عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے، مگر یہ تو امکان عقلی ہے عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص و طمع اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو بر تو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اندرونی وجدان و احساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز کو بھول جاتا ہے، اس لئے نوع انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن و امان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو، جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق، اسکے حقوق و فرائض کی تعیین کرے، ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں، اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال، انسانوں کے معمولی پیشوں، بخاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں، مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے، جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری

استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ انھوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول و قواعد وضع کئے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تعلیم سے مدارج علیا تک پہنچے پھر اخلاق اور روحانیات اور ملک و ملت کے مصالح و فوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

نبی کی عصمت پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے، کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے، اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے، جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقل معاش کی ضرورت ہوتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے، ہم کبھی اپنے اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے، اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے، بعینہ اسی طرح ان نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربے سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں ان سے اس کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی بحث نبوت کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے۔

مصلحین فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں، ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ پکے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو اور نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں، صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور و طریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و طاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عام اور تدبر کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے، الا یہ کہ منفعت عام کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کار کنان

عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لئے قرب و سکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے۔

مصلحین کے اقسام

مفہمین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کو مختلف استعدادیں ہیں اور اس بناپر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیب نفس کے علوم پاتا ہے، وہ کامل ہے، اور جو اخلاق فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے، وہ حکیم ہے، جو ملکی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے، اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملاء اعلیٰ کا نزول ہوا، اور وہ اس سے تعلیم پائے اور اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو، جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں، اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبت عظمیٰ سے خبردار کرے، جو اس دنیا میں ان کے لئے ان کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدر ہے اور ان کو بداعمالی کے سبب سے ان سے ربانی کی رحمت کو جو دوری ہے، یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اس کا نام منذر (ڈرانے والا، ہشیار کرنے والا) ہے۔

اور جب حکمت الٰہی کا یہ اقتضا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لئے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل وجان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہ الٰہی سے تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے وہ اس سے خوشنودی اور جو اس سے مخالفت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے، یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مراد الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اسکی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے نامزدگی بعثت ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ-۱)

وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا، اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران-۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لئے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (حج ۱۰) — تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ "تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے، وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیئے گئے اور آپ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کیلئے کسی قوم کا انتخاب یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لئے حکمتِ الٰہی کا اقتضا اس لئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی غیر معتبر ہے، وہ ان دونوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے، مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں، اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے، اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لئے بارگاہِ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ اس موقع پر چند باتیں اور قابلِ لحاظ ہیں اگر یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لئے قائم کی جائے تاکہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوتی ہیں، مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے قائم ہونے والی اس سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس دین کو درست کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح سے ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اسکو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اسکی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے کہ اس کو اس کا مستحق بنا دے جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی، یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و سلطنت برقرار رہے تو مجدد دین نبوت پیدا ہوتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اسکے دوستوں کو کامیابی اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے، قرآن پاک میں ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ — اور ہماری بات اسے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی

اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (والصّٰفّٰت - ٥)

طے ہو چکی ہے کہ انھی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔

ان دونوں بزرگوں امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے انبیائے کرام علیہم السلام کے احوالِ مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق وسیع ہوگی، ان کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا، اور ان پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے، جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکلوجی آف پیپل) یا نفسیاتِ رہنمائی (سائیکلوجی آف لیڈر شپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں، اس طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ "نفسیاتِ نبوت" کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرزِ گفتار، اسلوب تحریر اور طریقہ استدلال، غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے، اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روزِ پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سرِ مو انحراف نہیں کرتا، آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور ہر آن اور ہر لحظہ وہ اس میں معروف ہے، زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے، درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں، وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو اس کو انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں، بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا زندگی گزرتا ہے اور پھر مر جاتا ہے، کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے، اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحبِ عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لئے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور نیچا سوال کرتا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (مومنون - ٦)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (قیامہ - ٢)

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، سبزے اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے، پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے نہ سبزیاں اگیں، نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک

ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لئے انسان کی محتاج نہیں، لیکن انسان اپنے وجود کے لئے کارخانہ ہستی کے ایک ایک پرزے کا حاجتمند ہے، تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے، لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے، جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت تو یہ کہتا ہے۔

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ-۳)

اس نے تمہارے لئے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

پھر یہ بھی بتایا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ۔ (حج-۹)

اے انسان! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے اس کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ط (نحل-۲)

اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو اور سورج کو اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

ہستیاں دو ہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوقات کی، طاقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آرہی ہے، جمادات، نباتات کے، نباتات، حیوانات کے اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آرہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہیئے، مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلیٰ ہستی نہیں، تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے۔

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا، زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (ذاریات-۳)

اور میں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں، آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

(۲) دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں، لیکن قیاس و استقرا و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کرکے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے، ان کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیا تک محدود ہے جیسے حیوانات۔

(۳) تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقرا، و تمثیل کے ذریعے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب

کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا اسی لئے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار و حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں، ان کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہو سکتا ہے، اُن کے ان افعال، حرکات اور آثار کو جبلت، فطرت اور طبیعت کہتے ہیں، ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال، ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کردہ ازل سے ذ امت تک یکساں، ایک ہی طرح، اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ و اضطرار اس سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس کے ارادہ، اختیار ~~و فہم~~ سے صادر ہوتے ہیں صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں، جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی انجام اور مال کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔

جن و انس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں، جمادات و نباتات تو اس لئے کہ ان کے افعال و حرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں، یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دے دیئے ہیں، حیوانات بھی اس لئے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال و حرکات بھی تمام تر جبلی و طبعی ہیں، اور وہ جبلت و طبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں، یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لئے ان سے عصیان نہیں سرزد ہوتا، صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی اور خیر و شر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھ کر مآل کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے تحت کوئی کام کرتا ہے اس لئے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لئے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا۔

جمادات و نباتات اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۔ (نحل ۶)

اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں میں سے اور فرشتے وہ سرکشی نہیں کرتے اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں، اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔

اسی فطری اطاعت الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو، جیسا کہ قرآن میں ہے

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (نحل - ۹)

اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے ہیں اپنے لئے گھر بنائے، پھر ہر پھل میں سے کھا پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل مطیع ہوکر۔

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعت الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ، وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ۔ (نور - ۶)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھولے اس کی یاد کرتے ہیں، ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔

لیکن انسان کو دوسرے موجودات و مخلوقات کی طرح مجبور محض نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے، انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے اسی طرح وہ ارادی قدرت و اختیار، جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے، انسان میں ایک حد تک وسیع ہے، علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے، اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی "ارادی تکلیف" کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت الٰہی کے لئے نہیں بلکہ بالارادہ اطاعت کے لئے اس کی تخلیق ہوئی، فرمایا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (احزاب - ۹)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

یہ امانت اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہوا ہے، انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بارادہ اور باختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کرکے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح بارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کرکے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں، اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و اوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو، انبیاء و رسل وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور اور مجبول ہیں، اور کسی قدر با اختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں، قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ (حج-۲)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب مقرر ہو چکا۔

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص با ارادہ اور با عقل اور انجام بیں انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں، مطیع اور سرکش۔

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں سے جس صنف مخلوقات میں احساس، ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے، اسی قدر فطرت اس کی دایہ گری کی خدمات زیادہ انجام دیتی ہے اور جس قدر یہ احساس اور اختیار کا دائرہ اصناف ہستی میں بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر معلم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنف کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے، جمادات اپنی نشو و نما کے لئے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف آنکھیں کھولتی ہے ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے، حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں، ان کی غذا بے جوتے بے بوتے اپنے چشمے نکالے، بن سینچے پکائے، ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک اس کی جدوجہد، محنت و جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔

جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے، اسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے، طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر، احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ، فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آجاتی ہے، جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہیئے، ہوا وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہیئے، حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، ممکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پاکر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدود اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انبیاء اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی اس ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔

اس اختیار و ارادہ کے مرکز کا نام مذہب کی زبان میں قلب ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام

پاتا ہے، انبیا، اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لئے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاضِ قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر لبد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات و اختراعات کہتے ہو، ہر چیز و اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لئے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں، جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے، بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک ان ہی کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ازالہ مرض کی تدبیریں کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لئے خالق فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنے اپنے کام انجام دیتا رہتا ہے، ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصول تمدن، طریقہ معاشرت، آئین عدل و انصاف، اخلاق حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو دور شروع ہوتا ہے، اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا غول بن جائے۔

جو تمہارے لئے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے، جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سونار ہے جو تمہارے لئے کپڑے بنتا ہے وہ بنکر ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے، اور جو تمہارے لئے مادی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگران ہیں، ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہارے مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں، اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں، بعض وہ ہیں، جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں، یہ عام علماء ہیں، بعض وہ ہیں، جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں، یہ مجتہدین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ انبیاء ہیں، ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لئے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بننے، اوزار بنانے

اور صفائی کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لئے ہیں، ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دل کی رگوں پر غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال وافعال اور ہر قسم کے حرکات وسکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی "دل"۔ کیا انبیاء اور ان کے متبعین کے سوا نوعِ انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشوونما، حفاظت، ترقی، تکمیل اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالقِ فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مادی ترقی واصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی واصلاح کی بھی فکر کرتا اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی وتکمیل واصلاح کی خدمت نوعِ انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے، کیا اس کی شانِ ربوبیت کے ساتھ سوءظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے، وہ ان سب کو جو تمہارے لئے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بُنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں، اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت وغربت، سوسائٹی اور مجلس، حکومت اور اقلیم اور جغرافی وقومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے، باہم جوڑ دیتے ہیں، اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوامِ عالم کو اولادِ آدم، اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں، اور ان کے اخلاقی وروحانی عالم میں اصلاح وترقی اور امن وامان پیدا کرتے ہیں، ان کے دلوں سے بغض وکینہ کو نکال کر اخوت ومحبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح وغلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ انسانی طبقہ ہے جس کو ہم نبی، رسول اور پیغمبر کہتے ہیں، ان کو گو براہِ راست جسم وجسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب وروح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے، تاہم اس دل اور قلب وروح کی اصلاح کے لئے جسم وجسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب وروح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہہ اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک شبہہ یہ ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کے درمیان امن وامان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلم بھی کرتا ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے، علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلافِ نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے، کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اس کی زندگی اور اسبابِ زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قویٰ اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے، اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال واعمال کے حدود اور ان کے اسباب وعلل اور غرض وغایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایتھکس (فلسفۂ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع ومعاشرت) ہے، اگر جسم کی صحت ومرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے، دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا

ہوگئے ہیں تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور باایں ہمہ ان میں سے ہر ایک علم و فن علیحدہ اور ہر ایک علم و فن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور و قوت سے بازاروں گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب و علل کی تفتیش اور ان میں نظم و تسلسل اور علت و معلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفۂ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق و عادات کے اسباب علل تم کو بتاتے اور ناقابل فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے نہایت شیریں، خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا رہنما ہو، جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے، وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب و علل بتلائے بلکہ تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم و تلقین و فیض صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کر دے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کرے، البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے وہ انسانوں کو ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان کے قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے علم سے درست کر دیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے، وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب و علل کی تلاش و جستجو و تشریح کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ اخلاق سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ وہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ اعراف۔ ۹	وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔
رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ نساء۔ ۲۳	ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہشیار کرتے ہیں تاکہ رسولوں کے اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا۔
لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا	ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب

مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید-۳)

اتاری اور عدل کی ترازو تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں اور دنیا میں امن وامان کی زندگی بسر کریں۔

نوعِ انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں، ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیاء اور رسول نوعِ انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائیدار زندگی پر کیا پڑے گا، وہ جسم کی خدمت جسم کے لئے نہیں بلکہ روح کے لئے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجالاتے ہیں، وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لئے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔

وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے، بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں، وہ خیال آرا شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے، جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں، دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے۔

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ (شعراء-۱۱)

اور شاعروں کے پیرو کار گمراہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامانِ راحت فراہم کیا ہے اور جو ان کے قلب و روح کا سامانِ راحت بھی بہم پہنچاتا ہے، ان کو اس لئے بھیجا ہے کہ انسانوں کے قلب و روح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں، اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو اس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون واطمینان اور امن وسعادت کی روشنی میں داخل ہوں۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ (حدید-۱)

وہی خدا ہے جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا اس لئے کیا) کہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

انبیاء بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں، مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لئے نہیں بلکہ خلق کے لئے، وہ بھی جان ومال کی حفاظت کے لئے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعام شاہی اور تنخواہ ماہانہ پاکر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لئے نہیں، بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں۔ وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز واسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ، استقراء اور قیاس سے نہیں، بلکہ عالم اسرار کے مبدءِ علم سے فیض پاکر، وہ بھی حکیم و واعظ کی طرح پُر تاثیر کلام کرتے ہیں، مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں، بلکہ خدا سے سن کر، اور وہ صرف کہتے نہیں، بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں، اور دوسروں سے کراتے ہیں

وہ خدا سے ہیں، خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں، غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں،

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝

قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا، نہ بہکا اور نہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے، اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا درانحالیکہ وہ آسمان کے سب کے اوپر کناروں میں تھا۔

فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ (والنجم-۱)

تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی، نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا، اس کو جھوٹ کہا، کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو، نہ بینائی نے کجی کی اور نہ سرکشی کی اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔

قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (اعراف-۲۴)

کہہ دے اے پیغمبر، کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ اے انسانو! تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں، اور ان کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں، ہدایت اور رحمت ہیں۔

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝ (شعراء-۱۱)

یہ تو عالم کے پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا تاکہ تو ہشیار کرنے والے میں سے ایک ہو، فصیح عربی زبان میں۔

نکتہ:- یہ بالکل ممکن بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، نمود و غرض کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کرکے صرف مخلصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے کوئی رسم و رواج و معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے لیکن انبیاء کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور اسی کے بدلنے سے سب کچھ بدل سکتا ہے، ان کی غرض خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی معرفت ہوتی ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت و جلال کا ہر منظر خود ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے [illegible] انبیاء چونکہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت و طاقت ان کا مطمح نظر نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ

صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت، خدا کی خوشنودی ہوتی ہے اور باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیاء اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے، یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے، مبدء اور منبع کا فرق، غرض وغایت کا فرق، طریقِ دعوت کا فرق اور علم وعمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدء، منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی، شرحِ صدر اور وحی والہام ہوتا ہے، اور حکیم کے علم کا ماخذ ومنبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ، استقراء اور قیاس ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالقِ عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جد وجہد کا منشاء یا شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے، مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لئے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے، طریقِ دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل واسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے، لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضاجوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لئے ضروری نہیں، نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کرکے دکھانا اس کے لئے ضروری ہے، وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت وخلوت اور ظاہر وباطن میں یکساں حسنات سے کامل اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے، دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دو جانس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج ولشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تاکہ فتنہ وفساد رک جائے، فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطابہ سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی بات لوگ تسلیم کریں لیکن پیغمبر اپنے پیرووں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کرلیں، وہ اگر کبھی قانون وحد وسزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں، تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے، اولین نہیں، ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیرووں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر وناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہوجائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں، بے چون وچرا تسلیم کرلیں۔

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشورکشا اپنے زورِ بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے طبقے الٹ دیتے ہیں، انہوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان ومال پر اپنا قبضہ اقتدار جمایا، ان کی تلوار کی دھاک نے آبادیوں اور جنگلوں کے مجرموں کو روپوش کردیا اور بازاروں اور راستوں میں امن وامان پیدا کردیا، لیکن کیا انہوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے، اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم منواسکے، وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضہ اقتدار میں لاسکے؟ وہ آبادیوں اور جنگلوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کرسکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن وامان پیدا کرسکے، وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم ونسق قائم کرسکے؟

حکماء اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں، کیا وہ قلب وروح کے عجائبات کو بھی دریافت کرسکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار ورموز کو بھی حل کرسکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح وہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق وتفتیش سے فراہم کرسکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسنِ عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی، دوسرے حکماء نے اخلاق کے اسباب وعلل کے حدود، ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا؟ اچھائی کے بیج نے زمین پر نشو ونما پائی؟ ان کے اخلاق

و تعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرہ ان کی درسگاہوں کی چار دیواریوں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک اینچ بھی بلند نہیں ہوتی، حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ کے فروغ اور کامیابی کے لئے کوشاں رہتا تھا، یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور توحید پرستی کا درجہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر موثر بیان خطیب، ہر دقیقہ رس، متفنن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے، اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں، جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پُر اسرار عالم غیب سے ہو، وہ غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، عالم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہم سفیر و ہمنوا ہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لئے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

(۳) اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں، جن سے اس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

(۴) فضائل اخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو، اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے۔

(۵) وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روز الست کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

(۶) نہ صرف تعلیم، بلکہ اس میں یہ قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

(۷) اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے۔

(۸) اس کی دعوت، جہد و جہد اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلق خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت و رسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں، مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک نے جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۚ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ، وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ

اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں، بے شبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے، اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق کو

وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ وَمِنْ آبَائِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَلَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ

(انعام - ۱۰)

یعقوب بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو کہ ہر ایک نیکوکاروں میں سے ہے اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو ہر ایک کو بزرگی بخشی، دنیا والوں پر اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے، اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا، یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ جس کو چاہے چلاتا ہے، اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم)، اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں کا انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے دوسرے کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی، اے محمدؐ! تو بھی انہی کی راہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دہانی ہے۔

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں، اگر ہم ان کو یکجا کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف، خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں۔

(۱) فرمایا "ہم نے ابراہیم کو دلیل دی اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی"، جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

(۲) ارشاد ہوا کہ "ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکوکار تھے"، اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

(۳) یہ بھی کہا کہ "ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں یہ ہدایت عطا کریں"، جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

(۴) فرمایا کہ "ہم نے ان کو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم)، اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی"، اس سے معلوم ہوا کہ ان منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

(۵) حکم ہوا کہ "ان کی رہنمائی کی پیروی کر"، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

(۱۶) فرمایا کہ "اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا، یہ تو اہل دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے۔" اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمح نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق و نسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے، جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

(۱) اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

(۲) وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

(۳) وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

(۴) اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ کی نسبت یہ فرمایا گیا:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ ۔ ۱۵)

وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کو یکجا ذکر کیا ہے، جاہلوں کو آیات الٰہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الٰہی پڑھائی اور کتاب و حکمت سکھائی گئی ہوں اور دوسروں کو پاک و صاف بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود پاک و صاف ہو، کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم، اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا، ایک دوسری آیت میں ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَىٰ ۝ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَىٰ ۝ فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَخْشَىٰ ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى (اعلیٰ)

ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے، وہ جانتا ہے پکارا اور چھپا، اور ہم تجھ کو آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے، اور تو سمجھا، اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا کا لحاظ ہوگا، وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو، پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لئے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال کے درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے بسہولت از خود صادر ہونے لگیں، پھر اس کو دنیا کے سمجھانے پر مامور کرنا، اس رمز کو آشکارا کرتا ہے کہ دوسروں کی تعلیم و تذکیر کا منصب کو ملا ہے، اس کے بعد یہ فرمانا کہ "متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بدبخت محروم رہیں گے۔" اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔[^1]

نبوت کے لوازم اور خصوصیات

نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں

[^1]: یہ تشریح اور طریقۂ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

کا سدباب ہو، لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو خصوصیت کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں، یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں، ان ہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں، پھل پھول، چوپائے، پرندے، انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہی خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسری نوع سے ممتاز اور ہر صنف دوسری صنف سے علیحدہ ہے، گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو اور خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں، لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں، اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں، جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں، دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں مٹھاس، حنظل میں کڑواپن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک، نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہوگئی ہیں، اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورۂ بالا خاصیتیں فطرۃً ودیعت ہیں، لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوعِ انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں، جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی، یورپین، دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں، انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل، اخلاق و عادات وغیرہ، بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام انسانی اصناف جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں، انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاقِ فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی، سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں، ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے، ادب و انشاء کے خیالی بلند پرواز، عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس، اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے ادب و شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں، اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنفِ شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوت، تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں، اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور و فکر، دقتِ نظر، خارجی عالم سے بے پروائی، تصور میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی، الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے، ہنیبال و نپولین، تیمور و چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کئے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر کلہاڑی نہ مار سکا، اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل بادل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا، دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسم کو چکنا چور کر ڈالا مگر فردوسی

کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ نوعِ انسانی میں اشتراک ہونے کے باوجود اصنافِ انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم و صنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں، انہی مختلف اصنافِ انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوعِ انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف، خصوصیات، اور لوازم ہیں، جو انکو دوسرے اصنافِ انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں۔

وہبی استعداد ان میں سے سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں، اور انہی کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں، ان کی استعداد اور میلانِ طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جاکر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے، جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا، بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار، خواص، پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے، وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے، کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے، اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنے مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا، بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار، خواص اور کیفیات اسی میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے، شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا کہ میں اس وقت نبی تھا جب آدمؑ ہنوز آب و گل میں تھے[1]، اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے وہ عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں، اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں، وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلّم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلانِ خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم کے حالات و واقعات قبل نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی، حضرت ابراہیم کا نبوت پانے سے پہلے ہی سے آسمان و زمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے حضرت اسمٰعیل کا بے آب و گیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہِ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ

---

[1] جامع ترمذی مناقب نبوی و مستدرک حاکم مناقب محمدی جلد دوم ص ۶۰۰، حیدرآباد۔

کے ساتھ مقدس سفر کے لئے تیاری اور اس کم سنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری آمادگی اور صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحٰقؑ کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غلام علیم کا خطاب پانا، پھر مقدس باپ کی جانشینی اور اورشلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لئے انتخاب، کس مقصود کا دیباچہ ہے۔

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رویائے صادقہ اور صبر و شکر اور پاکدامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰؑ کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے ہی فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش، کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا آغاز عمر میں علم و فہم فصل مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰؑ کی دعائیہ پیدائش بچپن ہی میں ان کی نیکی سعادت مندی، نرم خوئی، پاکی، کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، تورات کی حقیقت رسی، کس روز روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دعائے خلیل، نوید مسیحا اور رویائے آمنہ اور احوال ولادت و تربیت مراسم شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، امانت، آثار خیر و برکت، نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خورشید جہانتاب کا مطلع انوار ہے

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہے۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صفت ۔ ۳)

تو ہم نے ابراہیم کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا، تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ خطاب ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۝ (طٰہٰ ۔ ۲)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق، تیری ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت یہ ارشاد ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ (مریم ۔ ۱)

اے یحییٰ! کتاب (تورات) کو مضبوطی سے پکڑ، اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی، اور تھا پرہیزگار، اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور نہ تھا زبردستی کرنے والا، نافرمان، سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔

نیز حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے۔

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا

ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنوز گہوارہ میں بچہ ہے عیسیٰ

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ (مریم ۲)

نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب الٰہی دی اور مجھ کو نبی ٹھہرایا، اور مبارک بنایا، میں جہاں ہوں۔

اور مکہ کا "الامین" نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ۲)

تو اس (پیغمبری کے دعوی) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

انبیاء علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات، باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل و قیاس سے نہیں بلکہ براہ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے، اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوہ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ علم انسانی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں۔

(۱) **وجدان**:۔ انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر، بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

(۲) **فطرت**:۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں، جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور ان ہی سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے، ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علماء کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں جبلت کہتے ہیں، حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرۃً ہوتا ہے، پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے، آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے، شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا، انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے۔

(۳) **بداہت اولیہ**:۔ انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا ادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک و شبہ راہ نہیں پاتا، دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے، ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سیاہ و سپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے، وغیرہ بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے اس کو بداہۃً معلوم ہو جاتے ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں ایک احساس اور دوسرا عقل، پہلے سے وہ گردوپیش کی مادی چیزوں کا، اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج ہیں، موجود نہیں بلکہ عالم الغیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں علم حاصل کرتا ہے۔

(۴) انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں، باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، باصرہ دیکھتی، سامعہ سنتی
شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی اور لامسہ چھوتی ہے، ان ہی کا نام حواس خمسہ ہے، انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے
ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آکر ٹکراتی ہیں، اسی کا نام احساس ہے ہم
چکھ کر مزا پاتے، سن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی و نرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں، ان
حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا
بھی کھاتے ہیں اور دریافت میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے، بیماری میں قوتِ
ذائقہ بدل گئی ہے اور اس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوتِ باصرہ نے ہم کو دھوکہ دیا ہے، ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری
ہوئی چیزیں چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتا ہوا جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم
کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم
ہوتے ہیں، لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

(۵) علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے
ہیں، اس کی بنیاد درحقیقت ان ہی معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان، الہام فطری یا جبلت، بداہت اولیہ، اور
احساس سے پہلے ہو چکا ہے، اور ان ہی معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقرا کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ
امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں، وہ غیر معلوم امر جس پر
معلوم امور کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں، اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ جزئیات کا
استقرا پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو، یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکہ دیا ہو یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو، طبیعیات اور سائنس کے
مسائل اکثر اسی طرح معلوم کئے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت
جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات یا بدیہیات و محسوسات پر علانیہ مبنی ہو
مابعد الطبیعۃ اور فلسفۂ الٰہیات کے مسائل اسی طریقِ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لئے ان میں اختلافات کی بڑی گنجائش
نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں
سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے، مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسی اشیا کے خواص کے
درمیان اختلاف اور فرق ہو سکتا ہے، غور و فکر، بحث و نظر، تحقیق، جستجو اور ترتیب مقدمات جو قیاس عقلی کے کارکن اور عامل
ہیں، وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں اسی لئے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے
پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری
ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک پیاس لگتی ہے، کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے
اور کیا کسی کے شک دلانے سے کہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو یا پیاس نہ ہو، کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک

اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہے، اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے، یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات و فطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے، دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، چھونا، یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آسکتا، یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں، کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔

محسوسات کے بعد بدیہیات اولیہ کا درجہ آتا ہے، انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان و قطعیت ہوتی ہے دو دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دونا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہو سکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ و سپید نہیں ہو سکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز و رشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بے وقوف ان ہی کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے، جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور جس کو علم معقولات کہتے ہیں، اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں، ایک طرف تو دنی کی سمت میں وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں اور دوسری طرف سمت کمال میں، عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا، ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بو علی سینا تک سب اسی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پرخطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔

عام طور سے انسانی علم کے پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے، جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے، غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے دوسرا یعنی فطریات کا علم خالق فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں، آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں، پانچواں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے، تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچا ہے وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں، بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہیں مشترک تعلق رکھتے ہیں، یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں، تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا ارادہ سے تعلق بہرحال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے، وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی دل و دماغ کے آئینہ پر اوپر سے آکر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں، جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے، اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے، اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی و روحانی سے لے کر بہر رو حانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔

فراست کے لفظی معنی تاڑ جانے کے ہیں، تاڑ جانے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی، مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہ تھا، ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے، جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے، اسی طرح ہر علم و فن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اخیار اور نیکو کاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله (ترمذی) مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے

(۲) فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے، فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ہی ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے، یہ چیز بھی اکثر کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرۃً عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقلا اور دانایان روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

(۳) کشف کے لفظی معنی تو کھول لینے اور پردہ اٹھانے کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آجاتی ہے وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے، عام لوگوں کے سمجھنے کے لئے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ خواب عالم خواب کی بات ہے اور

کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں، ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو کبھی کبھی بعینہٖ واقعہ ثابت ہوتی ہیں، اس طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے، ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں۔

(۴) الہام کے لغوی معنی دل میں ڈالنے کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے، جو محنت تلاش، تحقیق، غور اور ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آجاتا ہے، کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے، اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین، علماء، شعراء اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

(۵) وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفار اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں، اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں، یہ علم اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے ذریعہ یقینی ہیں، اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لئے یقینی ہیں، اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان، پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات، اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی پھر الہام پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف، یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں، اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعۂ علم کا نام مکالمۂ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) وحی (اشارہ) سے بات کرنا، یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا، یہ اگر حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے اور اگر خواب میں ہے تو رویا ہے۔

(۲) خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا، مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں، اس کو الہام کہہ لو۔

(۳) فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے، اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں، کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورہ شوریٰ میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ

اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے لیکن وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے اس کو وحی کر دیتا ہے بیشک

حَکِیۡمٌ (شوریٰ۔۵) اللہ بلند اور حکمت والا ہے۔

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ منقسم بھی ہے اور اپنی قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی آیت میں دیکھو فرشتے کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا ہے اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے، اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے۔

مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی اِنۡ ھُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (نجم۔۱) نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

الغرض اس امتیاز کے لئے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لئے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیئے گئے ہیں تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقۂ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے، بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے، خواب کے عالم میں رویا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے[1]۔

نکتہ:۔ اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان طریقوں سے اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے، مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص سے عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمالے۔

بہر حال غیبی ذریعۂ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں، اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پُر اسرار اور ناقابلِ فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین ذریعۂ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آسکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپرچولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب و کلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر، انبیاء کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے، جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے، اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکہ نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات

[1] ان اصطلاحات کی بحث کے لئے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ جلد سوم ص ۲۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۷ھ دیکھنی چاہیئے۔

میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے، اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا کسی کی آواز سن رہے ہو، شبہہ نہیں ہوا کرتا، اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہہ نہیں ہوا کرتا، غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن پاک میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے۔

فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ (یونس۔۲) — تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لئے ہے۔

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ (نمل۔۵) — کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔

رسول کہتے ہیں۔

وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (انعام۔۵) — اور میں غیب نہیں جانتا۔

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے سورۂ جن میں ہے۔

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (جن۔۲) — تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر کو جس کو پسند کرے۔

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ (عمران۔۱۸) — اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے، چن لیتا ہے۔

ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتہً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرما دیا گیا۔

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ إِلَّا بِمَا شَاءَ (بقرہ۔۳۴) — اور وہ خدا کے ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے، وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا ہے، بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں، مثلاً قیامت، بارش، موت، شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ کل کیا ہوگا؟ ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا، جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت

کے بعض منذر خواہ لوگوں کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انھوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی، خدا نے فرمایا۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (توبہ ۔ ۷)

خدا نے تجھ سے درگزر کیا، کیوں تو نے ان کو اجازت دی تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۔ (توبہ)

انھوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے یہاں تک کہ حق بات آگئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔

آگے چل کر ہے۔

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ (توبہ ۱۳)

یہ نفاق پر اڑے ہیں، تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا، بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیئے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں، قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کی اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں، اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا، گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے، وجدان، حواس اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں، ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں، جو علم حاصل نہیں ہوتا، اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شئے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہیں اور اس کا متقابل لفظ "شہادت" ہے، جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کہا ہے (انعام، رعد، حشر، تغابن) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہیں، اور غائب ہے، ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے، الغرض اجمالاً علم غیب اسی خصوصی طرح علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے۔

(۱) زمانۂ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد و سامنے موجود کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے اگر ہو سکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ، لیکن جس کے لئے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لئے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ

یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف تو تو ان

أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود-۴) کو پہلے سے جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (آل عمران-۵)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کیلئے) پھر ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا، اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا، اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا، اور نہ دوسروں سے معلوم کیا، اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا، وہ وحی کا ذریعہ ہے،

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ (یوسف-۱۱)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا ہے، بہرحال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو، تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے، قرآن پاک میں ایک موقعہ پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا،

فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوا ۚ إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ (یونس)

تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لئے ہے، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا گیا ہے، اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان)

خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي (اعراف-۲۳)

وہ قیامت کو پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے۔

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا

کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے

تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمان۔۴) کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔

۲۔ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں، تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا، ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لئے کسی نہ کسی مسافت عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے، جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بیکار ہے، ہم دلی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے، اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں، اس لئے زمانہ حال کے علم کیلئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں، ان کے بغیر جو علم حاصل ہوگا، وہ غیب ہوگا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں، کیا ہے؟ کس کو معلوم۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ (لقمان۔۴) اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے، جب تک ہمارے دیکھنے، سننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط بنا دیتے ہیں، وہ پورے نہ ہوں۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ہود۔۱۰) اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (حجرات) بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

۴۔ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں، جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرہ عمل سے قطعاً باہر ہیں، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آسکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (انبیاء۔۴) تو جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، غیب میں۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (بقرہ۔۱) وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں

وَالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ۔ (مریم۔۴) وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے، غیب میں۔

غیب "میں" کے معنی ہیں بے جانے، بن دیکھے۔ حواس سے علم حاصل کئے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جا سکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گزشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آمیز حالات سے بھی روایت اور تجربہ کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطے سے انکو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گزر چکا، آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امت محمدیہ کے انقلابات، قیامت کے مناظر اور اسکے بعد کے پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا، جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت و محشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہیں، اسی طرح حال کے ان احوال و مناظر کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود

ہونے کے احساس و تعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے، قبروں کا انکشاف، پس پردہ روایت، دوسروں کے موجودہ احوال سے واقفیت وغیرہ، اس علم غیب میں سے بھی پیغمبر کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس و تصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں، خود خدا کا دیدار، فرشتوں کی رویت، جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ، ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لئے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے، اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وحی اور ملکۂ نبوت

حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت ملکۂ نبوت کے لفظ سے ظاہر کی ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیب کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے، جمادات بے حس ہیں ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور دماغی قویٰ، حافظہ، تذکر اور غور و فکر کی قوت سے وہ محروم ہیں، ان سے اونچے حیوانات ہیں، جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں، ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوت احساس ہے، جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ، تصور، تعقل وغیرہ کے وہ قویٰ ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قویٰ ہیں، جو حیوانات میں نہیں، اسی طرح انبیاء میں علم و تعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات و عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے، اس ذریعۂ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور ان ہی کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرت نوعی، بداہت اولیہ، احساس اور غور و فکر سے معلومات حاصل نہیں کئے جاتے بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے، شرع کی زبان میں اسی کو وحی والہام کہتے ہیں، علم کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو غیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے یہی وحی ہے۔

امعان نظر سے معلوم ہوگا کہ اہل عقل و نقل کے اختلاف کا منشاء یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوت آغاز پیدائش ہی میں فطرۃً ودیعت کر دی جاتی ہے، اسی طرح انبیاء میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کر دی جاتی ہے یا یہ کہ وہ فطرۃً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم و فہم رکھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے وہ لوگ

جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں، وہ ان دونوں کو مجتمع کہتے ہیں،

ع
بار ما ایں وارد و آں نیز ہم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہ فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جن کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیاء محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر علانیہ سرفراز ہوتے ہیں، اسی کا نام "ملکۂ نبوت" ہے اور اہم امورِ دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے، اس کا نام "وحی" ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہی دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہِ راست وحی ہے مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماوراء ہے جیسے وحی قرآنی، وحی براہِ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوتِ علم و فہم کا نتیجہ ہیں، جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لئے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا منشاء ملکۂ نبوت کے ذریعہ وحیِ ربانی کی ترجمانی ہے اس لئے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت

اس تقریر کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الٰہی صحیفہ ربانی، توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نورِ نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسرا فروعی ہے یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں، کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے، کتاب براہِ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہم نبوی کا، کتاب بلفظہٖ وحی ہے اور سنت بالمعنی۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اس تشریح کا مقصود حقیقۃً تلاوت و عدمِ تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کہے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف حرف اور لفظ لفظ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں بلکہ صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لئے کتاب کی وہی مدوّن، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور

سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالالفاظ مقصود نہیں، اس لئے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قرأت کئے جا سکتے ہیں، اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ ان کو کتاب الٰہی کہا جا سکتا ہے مگر معنی اصولی حیثیت سے انکی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کرلی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل در آمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کرکے الفاظ اور کتب حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں، بنا بریں چونکہ سنت وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جا سکتی ہے، لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں، اس لئے وہ غیر متلو ہے

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے، قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لئے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جا سکتا ہے، اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں، جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کی فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے، اس لئے صحابہ کے دریافت پر یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک اور نکتہ بھی ہے کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تشریح چاہی اور انھیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے، اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ مستنبط ہوگا، اور اس لئے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کے بعینہٖ ان ہی الفاظ کو بے کم وبیش دہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہی الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے تو سوال کی نوبت آئی اس لئے ضرور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ کو بدل کر اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانونِ الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھنے والوں کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے، اس لئے اصل مفہوم و منشا کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور ملکۂ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں، اسی لئے ان کو اصطلاح میں "وحی غیر متلو" کہتے ہیں۔

ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں، قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت

کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے، یہ وحی الٰہی کا حقیقی منشاء ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منشاء الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے" کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے"، ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا "تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں"، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، صحابہؓ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے "وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو" حاضرین نے عرض کی یا رسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گزاری کر کے جنت نہ حاصل کر لی، ایک اور مجلس میں صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون کام پسند ہے فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا، دریافت کیا اس کے بعد، فرمایا، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (بقرہ-۹- نساء-۶) — ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

وَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ (اسرائیل-۳) — وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اُف نہ کہو۔

وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ — یہ (ماں باپ کے خدمت گزار) وہ ہیں جن کی برائیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں۔

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیان و تشریحات کا ہے۔[1]

احادیث، قرآن کا بیان ہیں

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق و وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کلی احکام کے تحت میں مندرج ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں صرف انکی تشریح فرمائی ہے، اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں، ایک وہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی، اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے، دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی، مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے جو کسی آیت کا جزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے، اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تمیز اہل علم کیلئے آسان ہے، تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرما دیا، اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقت نظر کا کام ہے، ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پا سکتے ہیں۔

الہام و اجتہاد و حکمت

امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں، دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں، تیسری وہ جن کا ذکر بظاہر، قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً، یہی تیسری قسم قابل بحث ہے، امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریے نقل کئے ہیں۔[2]

---

[1] مجھے یہی شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بحمد اللہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہوا کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے چنانچہ یہ خیال ابتداً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ (ص ۲۰-۲۹) مطبوعہ علمیہ مصر ۱۳۱۲ھ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام جلد اول ص ۱۰۵، ۲۱ مطبوعہ سلفیہ مصر ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

[2] کتاب الرسالہ امام شافعی ص ۲۸۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا، اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی، حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرے۔

(۲) رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ اس کے احکام فی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں، گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

(۳) تمام احادیث نبوی القاء فی الروع ہیں (یعنی رسول کے دل میں خدا نے ڈال دیئے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔

(۴) اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں، کتاب الٰہی سے جداگانہ مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین رائیں میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں، پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیق ازلی بھی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القاء فی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں، ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط، عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا، ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا، بلکہ وہ "پیغمبرانہ قوتِ فہم" کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس "پیغمبرانہ قوتِ فہم" کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القاء سے کرو یا اس کو حکمتِ نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق الٰہی کہو، بات ایک ہی ہوتی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور انکے جزئیات کتاب الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ و استنباط اور فہم اسکی اس پیغمبرانہ قوتِ علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکماء ملکۂ نبوت اور اہل شرع حکمت، الہام اور شرح صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

اجتہادِ نبوت اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح "اجتہادِ نبوی" کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تعلق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہاء کا طریقہ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہیئے کہ رسول اپنی اس حکمت ربانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی، گزشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہرحال خواہ فقہاء کے طریق پر اجتہادِ نبوی کو نصوص قرآنی سے مستنبط سمجھے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علم بینہ اور وحی شدہ اصول کلی کے جزئیات تسلیم کیجیے، ہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لئے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے کیونکہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیاء گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں، اس لئے امور رسالت اور امور دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہے، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے ضلالت نہیں، ان وجوہ سے ان کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا تو بجنسہٖ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے

(اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے، مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے، ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحی الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم، حکم الٰہی کے منشاء کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔[1]

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معنیً گزشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اسلئے اس اجتہاد نبوی کے معنی الہام، حکمت، ملکۂ نبوت، فہم نبوی وغیرہ گزشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ثانوی کی قرار پاجاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ساتواں مبحث احادیث نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقسام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے، اور یہ آیت:۔

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر-۱)

پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال بجزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دار و مدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا، قوانین شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے، لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضع قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ کو تعلیم کر دیا تھا، وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا، آپ اس کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا، ان کی تشریح فرمادیا کرتے تھے، حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً اخلاق صالحہ اور اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت

---

[1] سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے حوالہ کے لئے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی بہ التقریر والتحبیر للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۳ ص ۲۹۴، ۲۹۹ مطبوعہ امیریہ مصر ۱۳۱۶ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح ج ۲ ص ۵۲ مطبع مکتب صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنۃ۔

سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان سب اکثر کا دارومدار اجتہاد پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا، فضائلِ اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، ان قوانین کا بیان اوپر گزر چکا اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ میں صرف ایک آدمی ہوں، جب تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں۔ اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ میں نے ایک خیال قائم کیا تھا میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو، البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا، اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے، طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا ارشاد کہ تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو، اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دارومدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادۃً کیا، عبادت نہیں، اتفاقاً کیا، قصداً نہیں، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے، آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً ام زرع اور خرافہ کے قصے، وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابتؓ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی، اس طرح بیان کیا ہے کہ میں آپ کا پڑوسی تھا، اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے، تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ نے اپنے زمانہ کی جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں ہیں مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ اب ہم کو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت ؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے ان کو ہلاک کر دیا، بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے، لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ خاص اس کا کوئی اور سبب ہو اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی، اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں، مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے، آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے، اس کو غائب نہیں دیکھتا، اسکے معنی بھی یہی ہیں۔ (انتہیٰ کلامہ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی جو دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا

تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے، یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم سے ماخوذ ہیں
دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، ان کی متعدد صورتیں ہیں۔

(۱) کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں، تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

(۲) وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

(۳) وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے، جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں، مثلاً وضع و لباس، فرش پر نشست، کمل اوڑھنا، دسترخوان اور چمچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

(۴) وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا، مثلاً ام زرع اور ان کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

(۵) عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

(۶) زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے، آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کیا کرو تو کیا ہو۔ مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہو گئی، لوگوں نے آکر عرض کی، فرمایا میں نے ایسا خیال کیا تھا۔ انتم اعلم بامور دنیاکم۔ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو۔ یہ امور تغیر اور رد و بدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے، یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں، ایک براہ راست وحی الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہاد نبوی، یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے، شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے، مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول و قواعد کا علم، منصب نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرما دیا ہے، اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کلی کے جزئیات، مسائل کی تشریح، اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے۔

(۲) پیغمبروں کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا و غلطی سے یکسر پاک و منزہ

ہوتا ہے، کیونکہ ان کی رائے خطا و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے، اسی لئے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے۔

پیغمبرانہ اجتہاد کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے، اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القا، حکمت ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور اجتہادِ نبوی میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوتِ علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے، اس لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے، معنی کی نہیں، مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیاء آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمت نبوی میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہا، چنانچہ توراۃ و انجیل و زبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آسکتا ہے، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی، بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ نے نتائج حکمتِ نبوی کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا، تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو، بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض تشدد صحابہ اور علماء کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں، لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے، ان کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت و بے گناہی

نبی کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے، یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں، عیسائیوں میں صرف ایک مسیح کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے، اس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے ان سے بمقتضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت و صحت پر اعتبار کیا جا سکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پُر جوش اور پُر تاثیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے قرآن نے ان کے جواب میں کہا، درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۔ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ	شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اس کا زور انہی پر چلتا ہے جو اس سے

يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُوْنَ (نحل-۱۳) — دوستی کرتے ہیں اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس کے بعد آخر تک اسی خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ (نحل-۱۶)

اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگدل ہو بے شک خدا ان کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد متقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔

سورۂ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (شعراء-۱۱)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں ان پر اترتے ہیں جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گنہگار ہوتے ہیں لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں، کان ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (جاثیہ-۱)

پھٹکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار ہے خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، وہ سنتا ہے، اور پھر اپنے غرور پر اڑا رہتا ہے، گویا اس نے سنا نہیں تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جاتے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گنہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران-۸)

اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا، خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا، اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا اور ایک آیت میں فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ

کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپالے اور جو کوئی چھپالے گا، قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہوگا، پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور

أَوْ يُظْلَمُونَ ۝ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ (آل عمران-۱۷)

ان پر ظلم نہ ہوگا، کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو خدا کا غضب کمائے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے، انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک ایسے رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف بناتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے، کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا، اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سناتے، خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں، اور جو دوسروں کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انبیاء علیہم السلام کے لئے بار بار قرآن نے "چن کر پسند کرنے" کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (حج-۱۰)

خدا فرشتوں میں اپنے پیغمبر چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں میں سے۔

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرٰهِيمَ وَآلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ (آل عمران-۴)

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا سے چن کر پسند کیا۔

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا (بقرہ-۱۶)

ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔

حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا۔

إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي (اعراف-۱۷)

ہم نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں میں سے چن کر پسند کیا

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفا کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصٰرِ إِنَّآ أَخْلَصْنٰهُمْ

ہمارے خاص بندوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوت عمل) والے اور آنکھوں (قوت علم) والے تھے ہم

بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَإِنَّهُمْ عِندَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ (ص-۴)

نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۚ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ (انبیاء-۵)

ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے انکو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے، سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا۔

كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ (انعام-۱۰)

یہ سب صالحوں میں تھے۔

پھر آگے چل کر فرمایا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ (انعام-۱۰) ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔ پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ چلایا۔ صالح ہونا برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی و سعید اور گنہگار و نیکوکار، دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس اور اشتباہ ممکن نہیں، تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (جاثیہ-۱۰)

کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے بنائیں گے ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیاء کے وصف میں فرمایا۔

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ (احزاب-۵)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے، ازواج مطہرات کی شان میں ہے۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ ۚ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ (احزاب-۴)

اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہو، اگر تم متقی ہو۔

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادہ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف اور ستھرا بنائے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (احزاب-۴) — اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے اے نبی کے گھر والو اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے۔

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کے لئے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیاء کا کیا ذکر ہے، ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۖ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ (نور-۳) — گندیاں، گندوں کے واسطے اور گندے گندیوں کے لئے اور ستھریاں، ستھروں کے واسطے اور ستھرے، ستھریوں کیواسطے یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔

یہاں طیب، پاک اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے پن، پاکی، اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی ستھرے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیاء درحقیقت مقتدی اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب) — تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔

نیز ان کی اطاعت واجب ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (نساء-۹) — ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تصریح ہے کہ آپ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے۔

إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران-۳) — اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو تم میری پیروی کرو، خدا تم کو چاہے گا۔

کیا کسی گنہگار اور عصیاں کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، تاریکی سے روشنی کبھی نکلی، اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوتی اور گنہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے؟ برائی اور گنہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوت شر ہے، لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دام فریب سے آزاد ہیں۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا (اسرائیل-۷) — یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں، تیرا پروردگار (ان کا دشمنوں کی طرف سے) سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندہ رب ہو سکتا ہے۔

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری، وسوسۂ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر رہتا ہو (چھپا ہو) یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنہ سے اس کی ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا، مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری جو رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے، وہ ہر وقت تیری دست گیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتاب الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء-۱۷)

اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی، تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو، اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

اور یقیناً موقع ومحل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں، خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام اس فریب تمنا سے بھی پاک ہیں، بشریت کے اقتضاء سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوت حق کو لے کر وہ آئے ہیں، اس کی عنداز جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبول ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں، لیکن وہ مصلحت الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برقرار رکھتا ہے، فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (حج-۷)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا لیکن یہ کہ جب خیال باندھتا ہے تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (نجم-۱)

(اے مسلمانو!) تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بہکا۔

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سابق اور زمانۂ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی نے شفاء (قسم ثالث، باب اول) میں خفاجی نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملا دوست محمد کابلی نے تحفۃ الاخیار فی عصمۃ الانبیاء میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے، ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے، مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں، ان کے دو اسباب ہیں

اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دیتا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو، اور ان کا دامن گناہ و عصیان کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے، ایک عبد و غلام خواہ کس قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفاشعار اور مطیع و فرمانبردار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگذاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیئے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے وہ خدا کی عظمت و جلال اور اس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (شعرا - ۵)

اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت، اس کا نقص نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچے ہیں، وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفاشعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے، بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گزشتہ رتبہ، اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے تاکہ وہ اس کے مزید تقریب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (نصر)

جب اللہ کی مدد آ چکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندے کے حال پر رجوع ہونے والا ہے۔

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے، اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ وَیَهْدِیَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا وَّیَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًا (فتح - ۱)

ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی، اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہل عرب

قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (نساء-۲۴)

مسیح کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیاء کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، ان کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اس کی گنہگاری کا اعلان نہیں بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبول تام کی بشارت ہے، سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گزریں، ان کو پڑھو، تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز، مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی، اس لئے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جانفروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلۂ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرماتے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگزاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعتِ فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت فرماتے۔

عبدیتِ کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیح کے اس فقرہ میں نمایاں ہے، ایک سردار ان کو اے نیک استاد کہہ کر خطاب کرتا ہے، اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں،

"تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے، کوئی نیک نہیں، مگر ایک یعنی خدا۔" (لوقا۔ ۱۸-۱۹)

حضرت مسیح کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے، کس قدر غلط ہوگا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ:-

"اور جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو بخشتے ہیں، تو اپنے دَین ہم کو بخش دے۔" (متی ۶-۱۲)

ان کی گنہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیت کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ:- عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے، لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر، بھول چوک سے ہو یا قصداً، اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں، لیکن انبیاء کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیأت المقربین (نیکوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں) ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ "ذنب" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جرم، اثم یا حنث کا نہیں۔ ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل[1] ہے۔ اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفارِ ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول، چوک اور فروگذاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم اور لطف و عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابل مواخذہ نہیں مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے، اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے۔

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ (بقرہ-۴)	تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ (طٰہٰ-۷)	پھر خدا نے اس (آدم) کو برگزیدہ کیا، پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔
لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ (توبہ-۱۴)	یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔
فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ (انبیاء-۶)	پھر ہم نے اس (یونس) کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔
لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (فتح-۱)	تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی فروگذاشت معاف کرے۔

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبۂ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیاء کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

(۲) انبیاء کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیاء کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت، اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے، جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشامِ جاں کو معطر کرتے ہیں اس کے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے

---

[1] اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فروق پر کتابیں لکھی ہیں انھوں نے اس کی تصریح کی ہے ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس و ادیب الاب ہنریکس لا کی کتاب فرائد اللغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ الاثم الذنب الذی یستحق العقوبۃ علیہ ولا یوصف بہ الا المجرم و بین الاثم و الذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمداً کان او سہواً بخلاف الاثم فانہ ما یستحق فاعلہ العقاب فیختص بما یکون عمداً و الحنث ابلغ من الذنب لان الذنب یطلق علی الصغیرۃ والحنث والکبیرۃ والجرم و یطلق الاعلی الذنب الغلیظ (ص ۹۶، ۹۷) (مطبوعہ کاتھولیکیہ ۱۸۸۹ء)

ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی، ظہور نبوت کے بعد تاریکی اور ضلالت، اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے، اسی طرح انبیاء کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ ہے کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاء کے حق میں مستعمل ہے، اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (ضحیٰ-۱)

کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی اور اس نے تجھ کو بھولا پایا تو رہنمائی کی اور تجھ کو محتاج پایا تو بے نیاز کیا۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے، جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتہً ضلالت ہی ہے۔

"ضلالت" کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں بلکہ نادانستہ بھولنے بھٹکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں، عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے۔

أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ (بقرہ-۳۹)

بھول جاوے ایک عورت تو یاد دلادے اس کو دوسری۔

ایک اور آیت میں علم الٰہی کی تعریف میں ہے۔

لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى (طٰہٰ-۲)

نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ ضال کے معنی عربی زبان اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی کو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایت الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آتی ہے، جہل کی برائی تو معلوم ہو گئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے، حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مر گیا تھا، نبوت پا کر جب وہ لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم میرے فراری مجرم ہو، حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔

فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ (شعراء-۲)

میں نے اس حالت میں کیا تھا کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی، نہ بت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کا مر جانا، مارنے والے کا کوئی بالقصد گناہ نہیں، جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے، اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے یہاں "ضلالت" کہا گیا ہے، دوسری جگہ اس کو "غفلت" (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ‌ۖ وَاِنۡ كُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِيۡنَ (یوسف-۱)

ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں، کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا، اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا

اس "بے خبری" کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرمادیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا‌ ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ وَلٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا‌ ؕ وَاِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍۙ (شوریٰ-۵)

اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے اپنے بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

"کتاب وایمان" کے نور وہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت وحالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا اس سے مقصود حقیقی گنہگاری، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے، بلکہ طلب حق، تلاش معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے، آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے، یہ ہدایت کا دور ہے، چنانچہ ایک موقع پر انبیاء کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے۔

وَوَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ‌ ؕ كُلًّا هَدَيۡنَا‌ ۚ وَنُوۡحًا هَدَيۡنَا مِنۡ قَبۡلُ (انعام-۱۰)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد ضلالت ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبہ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری، عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدم نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت ورسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتہً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے افراط وتفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کی ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے، وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک خود خدا یا خدا کا جز یا ناسوت ولاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس

میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی غدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض صرف انسانوں اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، علانیہ تردید کرتا ہے، اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیئے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا اور انسانوں میں فرشتہ آتا بھی تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رُخ ہوتے ہیں، ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، دوسری طرف وہ اپنی روحانیت بے گناہی، پاکدامنی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں، یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے، وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں، یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا، پیغمبر ان کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے، تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا۔

أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا (اسرائیل ۱۱) — کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا۔

هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (اسرائیل۔ ۱۰) — میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔

ان کو شبہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کر سکتا ہے۔

أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا (تغابن ۱) — کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے۔

یہ وہی شبہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دے سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھے کہ انسان موروثی گنہگار نہیں، بلکہ وہ گنہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں، یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی اور انبیاء کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر، ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے۔

إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (ابراہیم۔ ۲) — تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ۔

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (انبیاء۔۱)	نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔
مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (مومنین۔۲)	نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

انبیاء کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے۔

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (شعراء۔۸)	تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔
مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (یس۔۲)	تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو بداہت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے۔

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (ہود۔۳)	ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں، لیکن خدا کے فضل وکرم سے سرفراز ہیں، اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے، فرمایا،

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (ابراہیم۔۲)	ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیاء نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں،

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں، اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کو مٹانے کے لئے تھا جو انبیاء کی شان الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں فرق و امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کی عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے، الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں، گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصب نبوت کا اختیار پاتا ہے جس وقت کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا، اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں، وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں، جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے نہ اسلام کا جزء ہے، یہ خیالات حقیقت میں دوسرے گروہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدہ باطل کی تردید میں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ

قوت ہونی چاہیے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کرادیں، قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا (کہف - ۱۲)	کیا وہ جنہوں نے کفر کیا، یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسولوں اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے، ہم نے ان کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے۔

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے، یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ (کہف - ۱۲)	کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ (حم السجدہ)	کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لئے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا کے دوسرے بندے، دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی درخواست کرنی چاہیے، یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اور ان کے عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا حضرت عیسیٰ کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے۔ چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، جہاں نہریں نہیں وہاں نہریں جاری کر دو، ہمارے سنسان جنگلوں کو باغ و بہار بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا	اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے جب تک تو ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا کہ تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرادو یا خدا کو اور فرشتوں کو سامنے لا کر دکھا دو یا تمہارے لئے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے، یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے

نَقْرَؤُهٗ (بنی اسرائیل - ۱۰) ایک نوشتہ نہ ہم پر اُتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔

یہ امور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازیگرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہِ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (اسرائیل - ۱۱)

کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں، رسول اور لوگوں کو جب اس کے پاس ہدایت آتی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا، مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے کہہ دے کہ اگر زمین پر فرشتے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان پر اُتارتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوتے اور ان کی حیرت انگیزی کو انھوں نے تسلیم بھی کیا پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے، قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا۔

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیاء)

یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا، مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوتی، ان سے کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں یعنی یہود ان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے آئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (انبیاء - ۱۰)

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تجھ سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جن کو ہم وحی کرتے تھے، جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف - ۱۲)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے، وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل - ۶)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اُتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو، جو ان کی طرف اُتارا گیا اور تاکہ وہ سوچیں۔

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت

کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور مخلوقیت سے ہے، ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے، یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے، ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علانیہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں، حالانکہ ان میں علم و جہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا، وحی و رسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثالاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں، ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قوٰی میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں، کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا، علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں، لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں، وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور بایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں وہ ایسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں، جیسے دوسرے کمزور جاہل اور بلید الذہن انسان، یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی ہے کہ وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا متصل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں أَيُّكُمْ مِثْلِي إِنِّي أَبِيتُ يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي[1] تم میں کون میرے مثل ہے، میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ کیا تم انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے۔

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے آپ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا وَكَذَلِكَ الْأَنْبِيَاءُ تَنَامُ أَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُمْ[2] اور اسی طرح سب انبیاء ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں، مگر ان کے دل نہیں سوتے، کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے، کیا عام انسانوں کو قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ کیا تم

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم [2] صحیح بخاری باب الاسراء۔

جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو، وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ، اور اس نے اس (فرشتہ) کو آسمان کے کناروں میں دیکھا، کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتساب سے اُمہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا، اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُمہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ (احزاب-۴) اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو، جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو، تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کے مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ كَاَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے، اسی لئے کسی انسان کو صاحب وحی ہونے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہادِ نبوی میں خطا

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی چند فروگزاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا، اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے، مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہادِ نبوی کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی، اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی، مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے، صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں اور اس سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبوی میں غلطی ہو جانا ممکن ہے مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں، ادھر لغزش ہوتی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی، اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا یا ان پر عمل کیا اور وحی الٰہی نے ان پر خاموشی برتی تو خدائے الٰہی نے گویا ان کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کئے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جس کا تعلق حکم دینی، شریعت ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے، اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور شریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا و غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقرا تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبوی میں نہیں ہیں، کیونکہ اجتہادِ نبوی نہ

ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ وہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقراء و تمثیل کے منطقی اور اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نورِ رسالت، فہم نبوت، حکمت ربانی اور شرح صدر پر مبنی و قائم ہوتا ہے، جن میں پیچ پیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں اسی لئے لفظ "اجتہاد" جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا چاہئے۔

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوتی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا، وہ کوئی گناہ یا بدی یا بد اخلاقی کا پہلو تھا، بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا، اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں، جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے۔

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی

جن اجتہادی امور پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے ان میں:

(۱) پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ کی مجلس میں آکر بیٹھے، آپ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبد اللہ بن ام مکتوم بھی آکر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ رؤسا بے حد مغرور اور خود پسند تھے، وہ آپ کے جلسوں میں صرف اس لئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں ہر حال بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہیں، اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے، عبد اللہ ابن مکتوم کا آنا جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور برائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا، اور راستہ سے بھڑک گئے۔

عبد اللہ ابن مکتوم کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی، یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبد اللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں، اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں حرج نہیں، لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگان مکہ پر اثر انداز ہوگی، اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی یہ سمجھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ ابن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سراپا متوجہ رہے، اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی،

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى

تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو تیرا سمجھانا کام آتا، وہ جو پروا نہیں کرتا، سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ ۝ وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ ۝ وَهُوَ يَخْشَىٰ ۝ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ۝ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۝ (عبس-۱)

تجھ پر کوئی الزام نہیں، وہ جو تیرے پاس دوڑتا آیا اور (خدا سے) ڈرتا ہے، تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب، آقا و غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں، اس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلے میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے انکو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے، مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا، اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صدائے عام ہے جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں، علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرمارہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے، اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ (۲) سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زر فدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مال غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ آکر سب سے پہلے سریۂ نخلہ میں مال غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مال غنیمت ملا، اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے، جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور سر برآوردہ تھے، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعض ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے جس سے انکو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے، نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے وہ بیکسی مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی اور مالی قوت میسر آتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے، غلبہ، قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشہ میں سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے، یہ بڑا ہی مشکل کام ہے، جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت رد عمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے، یہ کوئی آسان کام نہیں، سیاسی و مذہبی تاریخوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ ایسا نہ ہو سکا، خود عیسائی قوم کو دیکھئے جس نے یہودیوں اور بت پرست رومیوں کے ہاتھوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں، لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعۃً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے، تو عیسائی قوم کا پچھلا جوہر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے، انتقام کے نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاق انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوہ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا، غریب و تنگدست

مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسب معاش سے محروم اور معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغدار تھے، وہ دفعۃً مغلوب ہوگئے ان کے بڑے بڑے سرداران کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے اور انکے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یکدلی، یکجہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن دولت اگر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفرقہ اور حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابہ کرامؓ کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوت رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مال غنیمت، زر فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلاف رائے رونما ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپ نے امر اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مغلوب فاتح قوت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ نے رد فرما دی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجویز کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ تمہاری مثال ابراہیم اور عیسیٰ کی ہے اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰ کی۔[1] آپ نے حضرت ابراہیم کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰ کی رحمدلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زر فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جو ان میں نادار تھے، ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے پر آزادی کا فرمان عطا کر دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے۔

لیکن وحی الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو، ان غریبوں کا دفعۃً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی، مال غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے، لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی حقدار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا اس لئے ہم کو ملنا چاہیئے، یہی اختلاف زر فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا، جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (انفال)	(اے پیغمبر) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو تم مومن ہو۔

حضرت عبادہؓ بن صامت سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے، تو کہا:۔

فینا اصحاب بدر نزلت حین اختلفنا فی النفل وساءت فیہ اخلاقنا فنزعہ اللہ من ایدینا فجعلہ اللہ الی رسول اللہ صلی اللہ	یہ سورہ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق بگڑے ہوگئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱ کتاب المغازی حیدر آباد دکن۔ [2] سیرت ابن ہشام، ذکر الفئ ببدر والاساری ج ۲ ص ۲۹۱ مطبوعہ مصر محمد علی۔

علیه وسلم فقسمه رسول الله صلی الله علیه وسلم بین المسلمین عن سواء۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دے دیا تو آپ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرمادیا۔

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ پر کی اور آیت اتری۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ (انفال۔۹)

کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں تاکہ زمین میں فساد کریں، تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے، اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا حلال و پاک کر کے کھاؤ، اور اللہ کا ادب کرو، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زرِ فدیہ وصول ہوا یا اصول کیا جارہا تھا، اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (انفال۔۱۰)

اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔

بعضوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے زرِ فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کئے جانے پر ہوئی حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرِ فدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کریں تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو ان سے بطور فدیہ لیا گیا، ان کو بہتر دولت دیئے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زرِ فدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا، ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور ان مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔

بہر حال وہی مال غنیمت اور زرِ فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف و صریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرمالیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی، وہ آخر کار اجتہاد نبوی کے مطابق مناسب موقع پر جائز اور حلال و طیب ہی ٹھہرالیا اور غلطی غلطی باقی نہیں رہی، مال غنیمت لینے کے متعلق كُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ کا حکم اسی وقت آگیا اور فدیہ لینے کی اجازت اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً کے الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آگئی اور اس مال و دولت کی حرص و طمع سے اس وقت جو بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی، اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنادیا گیا، اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیئے گئے۔

تیسرا واقعہ

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ غزوۂ تبوک کے لئے جا رہے تھے، جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کی دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر لینے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش

۱؎ سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۹۱ ۲؎ مزید تفصیل کے لئے دیکھو سیرت النبی جلد اول میں غزوۂ بدر کا بیان۔

آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہوگئی، مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصوروار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ نے ان کا اعتبار کرکے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگزر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی۔

سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ، عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ (توبہ - ۶ - ۷)

وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو ان میں سچ بولتے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔

ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے واقف نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا، مگر علام الغیوب نے حقیقتِ حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا، بہر حال یہاں بھی منشائے خطا اگر خطا بھی جائے تو وہی ترحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ

منافقین کی نسبت آپ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی، اور فرما دیا گیا تھا کہ:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ (توبہ - ۱۰)

تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے یا نہ مانگے، اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا یہ اس لئے کہ انھوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی سلول کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا، اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا، آپ نے آکر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی جس کو آپ فرطِ کرم سے رد نہ فرما سکے، حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی کہ یا رسول اللہ اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے، فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا، بہر حال آیت بالا میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بیکار و بے سود بتایا گیا تھا، مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا تاکہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس سے تغافل فرمایا کہ ایک مخلص کی دلجوئی تو ہو گی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپنے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے اس لئے حکم ہوا۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ (توبہ - ۱۱)

اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو بے شک انھوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گنہگاری کی حالت میں مرے۔

پانچواں واقعہ

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کیلئے کسی مباح چیز کو جو آپؐ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا یعنی اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا

عہد فرما لیا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لئے اس کے نہ کھانے کا عہد کرے اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی، اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا، تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بیویوں کی خاطر داری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل و انصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی، اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتداء میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے، اور یہ ایک طرح سے شریعت الٰہی میں تبدیلی و تحریف کا مرادف ہو جاتا، اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبر کو کسی کی دلجوئی اور خاطر داری کی پروا نہ چاہیئے، فرمایا

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (تحریم۔۱)	اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے اس کو حرام کیوں کرتا ہے، اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے، مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی و معصومی کو پیش نظر رکھ کر اس کو اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں، اور اسی وحی الٰہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی، اب کیا کسی کا شبہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے، جن کی تنبیہ و اصلاح سر وقت وحی الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمت الٰہی نے پروا نہ کی اور خاموشی برتی، اگر کسی کو یہ شبہ ہے تو درحقیقت رسالت و نبوت کی مرتبہ شناسی اور دین الٰہی و شریعت ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرق رشد و ہدایت کی معرفت سے وہ کوسوں دور ہے، رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسان کو ان کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں نہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ الٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو، استغفر اللہ ثم استغفر اللہ! اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام صادر ہو جو حکمت الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر اللہ اس کی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد و رائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں، جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہام الٰہی، القائے ربانی، حکمت یزدانی، فہم رسالت بلکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرم اسرار شریعت عمر فاروق رضی اللہ عنہ برسر منبر فرماتے ہیں۔

یا ایها الناس ان الرای انما کان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبا لان اللہ کان یریه وانما هو منا الظن والتکلف (ابو داؤد کتاب الاقضیہ)	اے لوگو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے غلطی سے پاک تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے، ہمارا گمان، اور از خود کہنا ہے۔

وہ رائے نبوی جو خدا کے بتانے اور دکھلانے سے قائم ہوتی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلام ربانی کی ہم پایہ ہے، حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے در حقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے، قرآن پاک میں ہے،

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (نساء - ۱۶)

ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دکھایا، سوجھایا، اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی، وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے، جس کی نسبت خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا،

انا اقضی بینکم برائی فیما لم ینزل علیّ (ابوداؤد۔ اقضیہ)

میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوتی اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دست گیری کرتی اور صحیح راستہ پہ لے آتی جیسا کہ گزشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو ارادت الٰہی ہوتی تھی یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ ارادت الٰہی (خدا کی طرف سے سجھایا جانا) تاکہ آپ کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں، غلط نہیں ہو سکتی، لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مقدمہ سے فرمایا،

"میں ایک بشر ہوں، تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو، اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں تو میں اگر کسی کو وہ حق دلادوں جو اس کا نہیں، بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں" (کتاب الاقضیہ)

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے اس لئے امت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سر تا سر مغالطہ ہے، اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعوی کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں، اور اگر ہو بھی تو یہ دعوی بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنی نہیں قرار پا سکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی غیر صحیح و صواب اور

عادلانہ نہیں ہوتا تھا، یہ کسنار رسول و نبی کی شان کی توہین و تحقیر ہے اور اس ارادت الٰہی کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا، اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط کے مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمالیا اس کے مطابق مناسب و صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوتی اور نہ ہو سکتی تھی اور امت آپ کی پیروی آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے، نہ کہ نزاع مذکور کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں فَشَتَّانَ بَيْنَهُمَا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا یا برسر باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کرلے، یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا لیکن جب عدالت نبوی نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہوگئی اور غصب حق کے گناہ سے برأت ہوگئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا، گو قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا، مگر عند اللہ جو برسر حق تھا، وہ حق ہی رہے گا اور جو برسر باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا، اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا، اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے (ابوداؤد کتاب الاقضیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے صادر فرماتے تھے وہ تمام تر حق منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف، کفر و نفاق تھا، اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (نساء-۹)

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پاویں اور مان کر قبول کریں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا (احزاب-۵)

اور کسی ایمان دار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جو خدا اور اس کے رسول کے بے حکم چلا وہ صریح گمراہ ہوا۔

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم برسر باطل پہلو پر ہو سکتا ہے، چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ

اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے چلے آئیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا بلکہ

أُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ (نور - ۶) وہی بے انصاف ہیں

عقل بشری اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں وہی عقل ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی والہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں، اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں، ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں۔ فرمایا، میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا، اس نے جا کر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہ نے جو سرتاپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا، اور ایسا کرنا چھوڑ دیا، پھل اس سال کم آئے یا کم ٹھہرے، آپ کا پھر گزر ہوا تو ان لوگوں نے صورت حال عرض کی، آپ نے فرمایا میں نے تو یوں ہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی، مگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا ہے تو کریں، پھر فرمایا۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِي فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ۔ (ج ۲ ص ۲۶۴)

میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہارے دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ

تم اپنے دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔

تیسری روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

فانی انما ظننت ظنا فلا تؤاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذوا به فانی لَنْ أَكْذِبَ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔

میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امر دنیا سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے یہ کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ امور دین و شریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور منجانب اللہ ہے، لیکن کھیتی باڑی، علاج و معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ نے کچھ کہا ہے تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے، پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے، آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرماتے، غزوہ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک صحابی نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے، فرمایا محض رائے سے ہے

یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرأی، ج ۲، ص ۲۶۴ میں ہیں۔ وص ۲۶۴ طبع کراچی۔

تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں، فلاں مقام بہتر ہے، آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا، اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہ سے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کا حکم ہوا، یعنی امورِ حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو، کا حکم خدا کی طرف سے ہے، چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا، لیکن امورِ جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقلِ بشری سے نہیں بلکہ وحیِ الٰہی یا فہمِ نبوی سے ہوا تھا، اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلح حدیبیہ کے شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحتِ الٰہی اور حکمتِ ربانی پر مبنی تھے، ان کے بدلنے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے کیا کیا زور نہیں لگایا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ التفات نہ فرمایا، اور آخر مستقبل نے بتادیا کہ فہمِ نبوت سراسر صحیح تھا، اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبد اللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا مگر مدینہ سے باہر جاکر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتادے گا کہ دنیا میں ہر صاحبِ فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم و تربیت، مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے، ایک شخص جو فنِ تعمیر کی عمارت اور ہندسہ اور انجینیرنگ کی صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے، بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زورِ فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہو، وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے زیادہ کم عقل ہو، یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں، اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقائق، تزکیۂ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ داں عقل رکھتا ہو، اس کو تعمیر و کاشت کاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام امورِ دین و شریعت میں وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ، سامان و اسلحۂ جنگ و سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کلی مصلحتیں بتاکر، جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز کیا، اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں، پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرزِ لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے سترِ عورت نہ ہو دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نسق اور نظامِ حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو، لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہلِ حل و عقد کا باہمی مشورہ ہو، وعلیٰ ہذا القیاس۔

الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے، اس لئے ان کو ہمیشہ کے

لئے محدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت گزشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی میں علم و فہم کے تین درجے ہیں، وحی ملکۂ نبوت، اور عام عقل بشری، ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علماء نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں، مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں، سلف صالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیق ازلی اور قوت تبیین سے تعبیر کیا ہے[1]، امام غزالی و امام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو پیغمبرانہ قوت اجتہاد کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے، مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح اسرارِ شریعت کا بیان اور دقائق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھیے، جن کا تذکرہ قرآن نے جابجا کیا ہے، تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ علم نبوت ہے جس کو کہیں ذکر (یاد داشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرحِ صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سوجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں اراءت (دکھا دینا سوجھا دینا) کہا گیا ہے، ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقلِ بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لئے نہیں کہ عقلِ بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقلِ نبوی اور حکمت نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے آل ابراہیم پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے۔

۱۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (نساء)	تو بے شبہ ہم نے ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت لقمانؑ کی نسبت ہے۔

۲۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (لقمان ۲)	اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔

حضرت داؤدؑ کی شان میں ہے۔

۳۔ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص ۲)	اور ہم نے داؤد کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا۔

---

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

۴۔ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ (بقرہ۔ ۳۳)

اور داؤدؑ نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے اس میں سے کچھ سکھایا۔

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں۔

۵۔ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ (زخرف۔ ۶)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ پر اپنا احسان جتاتا ہے، تو فرماتا ہے۔

۶۔ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (مائدہ۔ ۱۵)

اور (یاد کرو) جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔

عام انبیاء کے متعلق ہے۔

۷۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران۔ ۹)

اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی۔

۸۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (بقرہ۔ ۱۵)

ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔

۹۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ۔ ۱۸)

جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ہم پر جتایا ہے۔

۱۰۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران۔ ۱۷)

یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنا یہی احسان انہی الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہراتا ہے۔

۱۱۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ

وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (جمعہ-۱) کھلی گمراہی میں تھے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء-۱۷)

اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کردے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔

۱۳- ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (اسرائیل-۴)

یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے۔

۱۴- وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (بقرہ-۹)

اور اللہ کا جو احسان تم پر اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے ان کو یاد کرو، خدا تم کو اس سے سمجھاتا ہے۔

خاص طور پر ازواج مطہرات کو خطاب کیا ہے۔

۱۵- وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب-۴)

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔

یہ نعمت حسب تعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے۔

۱۶- يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ-۳۷)

اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت بخشی گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے۔

۱۷- اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل-۱۶)

اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کرو۔

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے۔

۱۸- وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ حِكْمَةٌ ۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (قمر-۱)

اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہو سکتی ہے پہنچ چکے ہیں موثر حکمت تو ان کو ڈرسنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئی ہیں جن میں حکمت کا لفظ آیا ہے، ان میں کہیں حکمت کا لفظ تنہا آیا ہے اور کہیں کتاب کے بعد آیا ہے، کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں ایک صحیفہ ربانی اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نوشتۂ الٰہی اور علم الٰہی جیسے لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ (اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا) مذکورہ بالا آیتوں میں تو کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفہ ربانی

یا یوں کہو کہ وحی سے کتاب مراد ہے جیسے توراۃ و قرآن وغیرہ لیکن حکمت کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے ؟

حکمت کے لغوی معنی دانائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے اس تحقیق کے لئے ضرورت ہے کہ مستند اہل لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کرکے تبصرہ کیا جائے، سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب جمہرۃ اللغۃ میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے،

کل کلمۃ وعظتک او زجرتک او دعتک الی مکرمۃ او نھتک من قبیح فھی حکمۃ و حکم (جلد ۲، ص ۱۸۶ حیدرآباد)

ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللغۃ میں لکھتا ہے۔

الحکمۃ من العلم والحکیم العالم وصاحب الحکمۃ والحکیم المتقن للامور (جلد ۲ ص ۲۰۶، مصر)

حکمت یعنی علم، اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا۔

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے۔

والحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ افضل الاشیاء بافضل العلوم (ج ۱۵، ص ۳، مصر)

اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔

لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں۔

والحکمۃ اصابۃ الحق بالعلم والعقل فالحکمۃ من اللہ تعالیٰ معرفۃ الاشیاء وایجادھا علی غایۃ الاحکام من الانسان معرفۃ الموجودات وفعل الخیرات (ص ۱۲۶، مصر)

اور حکمت، علم اور عقل کے ذریعہ سے سچی اور صحیح بات کو پہنچنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں، اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے، ابن حیان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کردیا ہے[1]۔

۱۔ قال مالک وابو رزین: الحکمۃ الفقہ فی الدین والفھم الذی ھو سجیۃ ونور من اللہ تعالیٰ۔

۱۔ امام مالک اور ابو رزین کا قول ہے، حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے

۲۔ وقال مجاھد: الحکم فھم القرآن۔

۲۔ مجاہد کا قول ہے حکمت یعنی قرآن کا فہم۔

۳۔ وقال مقاتل: العلم والعمل بہ لا یکون الرجل حکیما حتی

۳۔ مقاتل کا قول ہے، حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں، کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ

---

[1] زیر آیت وابعث فیھم رسولا منھم الآیۃ، ج ۱، ص ۳۹۳ مطبوعہ سعادت مصر

يجمعها۔

علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔

٤۔ وقيل: الحكمة، القضاء۔

۴۔ بعضوں کا قول ہے، حکمت فیصلہ کرنا ہے۔

٥۔ وقيل: ما لا يعلم الا من جهة الرسول۔

۵۔ کسی کا قول ہے، حکمت وہ ہے جو رسولوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہوسکے۔

٦۔ وقال ابو جعفر محمد بن يعقوب: كل صواب من القول ورث فعلا صحيحا فهو حكمة۔

۶۔ ابو جعفر کا قول ہے، ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔

٧۔ وقيل وضع الاشياء مواضعها۔

۷۔ کسی کا قول ہے چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا حکمت ہے۔

٨۔ وقيل: كل قول وجب فعله۔

۸۔ ایک اور شخص کا قول ہے، ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو، حکمت ہے۔

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں۔

١۔ قال مالك: المعرفة بالدين والفقه في الدين والاتباع له۔

۱۔ مالک کا قول ہے، دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔

٢۔ قال ابن زيد: الحكمة الدين الذي لا يعرفونه الا به صلى الله عليه وسلم يعلمهم اياها قال والحكمة العقل في الدين وقرء ومن يؤت الحكمة فقد اوتي خيرا كثيرا وقال لعيسى ويعلمه الكتب والحكمة والتوراة والانجيل، وقرء ابن زيد، واتل عليهم نبا الذي آتيناه آيتنا فانسلخ منها قال لم ينتفع بالآيات حين لم تكن معها حكمة قال والحكمة شئ يجعله الله في القلب ينور له به۔

۲۔ ابن زید کا قول ہے، حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سکھاتا ہے نیز انہی کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے۔ ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ ان کو اس کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہوگیا، یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کیونکہ ان کے ساتھ حکمت نہ تھی، انہی کا قول ہے کہ حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ اپنے بندے کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔

٣۔ عن قتادة: والحكمة اي السنة۔

۳۔ قتادہ سے مروی ہے، حکمت یعنی سنت نبوی۔

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں،

٤۔ قال ابن جرير الطبري: والصواب من القول عندنا في الحكمة انها العلم باحكام الله التي لا يدرك علمها الا ببيان الرسول صلعم والمعرفة

۴۔ ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان و تشریح سے معلوم ہوتے ہیں اور ان کی اور جو ان کی مثالیں اور نظیریں ہیں، ان کی

بها وما دلّ عليه ذلك من نظائره وهو عندي ماخوذ من الحكم الذي بمعنى الفصل بين الحق والباطل۔

معرفت کو کہتے ہیں اور "حکمت" کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق وباطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں۔

ہ وسمعت من ارضی من اهل العلم بالقرآن يقول: الحكمة سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم (ص۳۲)

ہ میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے۔

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں۔

وسنته الحكمة التي في روعه عن الله عز وجل (ص۲۸)

اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو، تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں، حکمت عقل وفہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح وغلط صواب وخطا، حق وباطل اور خیر وشر کے درمیان تمیز وفیصلہ بذریعہ غور وفکر، دلیل وبرہان اور تجربہ واستقراء کے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحب حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت کامل بہم پہنچاتے ہیں، دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ ہی اس کے متعلق بچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف حرف صحیح دیتے ہیں، اسی کا نام آپ صحت وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں، شاعری، انشاء پردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں، اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق وباطل اور افعال کے خیر وشر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے، وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق ووجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور وفکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے، یہی وہ معرفت اور نور الٰہی ہے جو جد وجہد اور سعی ومحنت سے نہیں بلکہ عطا وبخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام "حکمت" ہے۔

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد لوگ معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک لوگوں کو عطا ہوتی ہے اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں، لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر "حکمت" کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت حکمت کے آثار ونتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمان کو حکمت دیئے جانے کا بیان ہے، اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے، "اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر وفخر وغرور کی ممانعت، میانہ روی، آہستہ بولنا،" اسی طرح تیرھویں آیت میں حکمت محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے، "شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان،

قرابتداروں اور بیکسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر و غرور کی مذمت، ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰىٓ اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (اسراء-۳) — یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں یعنی وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرتِ انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے، یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت حکمت والا قرآن ظاہر کی ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (لقمان و یونس) وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یٰس) وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (آل عمران) ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حکمت کی بعض اہم تعلیموں کو وحی الٰہی خود اپنے اندر بھی شامل کر کے ان کو آپ مقتطر بنا دیتی ہے، یہ چیز انبیاء کو کتاب الٰہی کے ساتھ ساتھ عام طور پر ملتی ہے، فرمایا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران) — اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔

بہرحال یہ حکمت کی قوت انبیاء علیہم السلام کو بدرجۂ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات دانائی اور ان کا ہر کام دانشمندی پر مبنی ہوتا تھا اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی اس لئے اس کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے جن کا صرف اقرار و اعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق میں داخل ہوا، پندرھویں آیت میں ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب-۴) — (اے محمد رسول اللہ کی بیویو) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔[1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو آیاتِ الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و دانائی کی باتیں تھیں، اب اگر وہ باتیں امورِ دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا، اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارھویں آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں ہے۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ-۱) — وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے، ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی تعلیم وہ دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی کہ جو چیز ان کے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، اور جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے، جن کی آپ تعلیم فرماتے تھے اور اپنے ان امورِ حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں۔

---

[1] لفظ یتلیٰ سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لئے خاص ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سناتے تھے بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ (زخرف ۶)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنیین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توراۃ کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے، تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی۔

بارھویں آیت میں ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (نساء ۱۷)

اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کرے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا، اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا، اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت، خطاب سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب سے حاصل ہوتی ہے، الغرض اس حفاظت وعصمت کے حصول میں کتاب الٰہی کے ساتھ، حکمت ربانی کے انعام کو بھی دخل کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینۂ نبوت تھا، لیکن یہ فیض حسب استعداد پیغمبر کی اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغ اسلام کے تین ذریعوں حکمت، موعظت اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے میں سب سے اول حکمت کو جگہ دی گئی ہے

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (نحل ۱۶)

تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر۔

یہی سچی اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے، فرمایا۔

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ (قمر ۱)

دل کو پہنچ جانے والی حکمت۔

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور ہر بھلائی کی اصل ہے، پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے اس لئے ارشاد ہوا۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (بقرہ ۳۷)

جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت نیکی (دولت) دی گئی۔

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جن سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرآن اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا۔

۱۔ و، کا، میں حرف علت سے قبل اور آیا کرتا ہے جیسے ولیکون من الموقنین، یہ حرف عطف نہیں۔

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً وَاِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا بعض شعر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔

ایک حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریروں کو جادو کہا گیا ہے، اس تقابل سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اس کے اردو مفہوم سے بلند تر ہے لیکن سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح حکمت کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق تجربہ تخیل ضرور ہے، اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اور اردو میں اس حقیقت کی حکمت کے ساتھ لفظ "الہامی" بڑھا کر ادا کیا جاسکتا ہے یعنی الہامی حکمت۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر، ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے اور دوسرے رجل اٰتاہ اللّٰہ الحکمۃ فھو یقضی بھا و یعلمھا (صحیح بخاری کتاب العلم) اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے، تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے، جب عام انسان کا یہ درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی اور وہ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں بھی آئی اب اس حصولِ دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہیے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب و حکمت کی تعلیم

اوپر کی چار آیتوں ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ-۱) وہ رسول ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین کاموں کا ذکر ہے۔

(۱) خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔

(۲) ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک و صاف کرنا اور سنوارنا۔

(۳) ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو۔ اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کا فائدہ کیا، کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتلوا (یعنی تلاوت کرتا ہے) ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتیں پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے، تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے، بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے، خصوصاً جب کہ تعلیم کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہے، وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہتا ہے، کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ سنا دینا اور پڑھا دینا یا دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآن کی تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا، اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معنی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم حق ہے جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے

اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی، اور اس کی تعمیل بھی امت کے لئے ضروری ہوگی، آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہؓ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل کے ذریعہ سے محفوظ رکھا اور وہ احادیث و سنن کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد "حکمت" کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آجائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں، کتاب الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں، کتاب الٰہی، وحی ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن، سینۂ نبوی کی طباعۂ حکمت کا، اس مقام پر امام شافعی کی یہ تحقیق پیش نظر رہے۔

وسنتہ الحکمۃ التی فی روعہ عن اللّٰہ عز وجل (کتاب الرسالۃ مصر ص ۲۸)

اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحکمۃ فھم القرآن حکمت فہم قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوتی سنت ہے اور اسی معنی کو امام مالک اور ابو رزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ حکمت معرفت دین، فقہ دین اور اس علم دین کو کہتے ہیں، جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کرکے اس کو منور کر دیتا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت، نبوی نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و سینہ میں ودیعت کیا تھا اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں، اس لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی، انبیاء کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات و صفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی، حضرت ابراہیمؑ توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔

يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ (مریم ۳)

اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

حضرت خضرؑ کے متعلق ہے۔

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (کہف ۹)

اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے پھر "اپنے پاس سے علم سکھانے" کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت کوشش اور جد وجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجانب اللہ کہی جاتی ہے، اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں، جو انسان کے طبعی ذرائع علم واستدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو، یہی علم

خداداد ہے اور اسی لئے صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا (نمل - ۲)	اور بے شبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔

حضرت یوسفؑ کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے۔

وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ (یوسف - ۱)	اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نوازے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت (تاویل) سکھائے گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشاء وحی موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاقِ کلام سے علم کے یکبارگی دیئے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت میں تو تاویلِ احادیث کا علم یک دفعہ دیئے جانے کی تصریح ہے، اسی لئے حضرت یوسفؑ ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں۔

ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي (یوسف - ۵)	یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت ان پر وحی آکر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کر دی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیاء کو بچپن ہی میں علیم (جاننے والے) کا خطاب ملا۔

وَبَشَّرُوهُ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ۔ (ذاریات - ۲)	اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوشخبری دی۔
إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ (حجر - ۴)	ہم تجھے ایک بڑے صاحبِ علم فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں۔

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے، عالم نہیں، اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے۔ ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے، اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم و حکم | بہت سے انبیاء کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کر سکتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

والحکم بالشیء ان تقضی بانه کذا اولیس کذا سواء الزمت ذالك غیرك اولم تلزمه (۱۲۶۔ مصر)	کسی شے پر حکم کرنا، یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شے ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کرو یا نہ کرو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے۔

الحکم العلم والفقه والقضاء بالعدل (۱۵۲۔ ۳)	حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔

ان انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (یوسف - ۳)	اور جب یوسفؑ جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے۔

وَلُوطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء۔۹)

اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم دیا۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے ذکر میں ہے۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء۔۶)

تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھایا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔

حضرت یحییٰ کی نسبت ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۚ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (مریم۔۱)

اے یحییٰ! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ، اور ہم نے اس کو حکم بچپن ہی میں عطا کر دیا۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (جاثیہ۔۲)

اور بلاشبہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں، یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے، یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوتِ فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے:۔

فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ (ص۔۲)

ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص۔۲)

تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (مائدہ۔۲)

اور تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ (انبیاء۔۶)

اور داؤدؑ اور سلیمانؑ کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ (شوریٰ۔۲)

اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر کہی گئی ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (انعام)

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنانے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت و سلطنت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمانؑ اور داؤدؑ اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسفؑ اور موسیٰؑ کو بھی شامل کر لیجئے۔ باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا، اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح و صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان

پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا، غلط فہمی کا پردہ چاک کرنے کے لئے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالئے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (آل عمران-٨)

کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو، بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھلاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خدا والے بنو۔

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے، بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰ ہیں، وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے، جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں تھا، ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو تو حکومت و سلطنت کا ادنیٰ شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک جب بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ میں بھی حکم سے مراد وحی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے حکومت و سلطنت نہیں، تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو۔

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهِ ۚ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِينَ (انعام-٧)

کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو، میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کر رہے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا، وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس سے صاف و صریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم و فہم، فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے اور اس لئے رسول کی اس قوت و طاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرح صدر

ربانی علم و معرفت کا ایک اور مقام شرح صدر ہے، شرح صدر کے معنی "سینہ کھولنے" کے ہیں، عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق جہل و نادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے، اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت و مسرت حاصل ہو جاتی ہے، جمہرہ ابن درید میں ہے۔

والشرح من قولهم شرحت للشئ الامر اي اوضحته وكشفته وشرح الله صدره فانشرح اذا تسع بالقبول

شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ میں نے تیرے لئے بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے

الخیر (۲-۳۴۲)

قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔

صحاح جوہری میں ہے۔

الشرح الکشف تقول شرحت الغامض اذا فسرته۔

شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اس کی تفسیر کر دی۔

لسان العرب میں ہے۔

الشرح الکشف یقال شرح فلان امری اوضحه وشرح مسألة مشکلة بینها وشرح الشیٔ یشرحه شرحا وشرحه فتحه بینه و کشفه وکل ما فتح من الجواهر فقد شرح ایضا تقول شرحت الغامض اذا فسرته وشرح الله صدره بقبول الخیر یشرحه شرحا فانشرح وسعه لقبول الحق فاتسع۔

شرح یعنی کشف ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اس کو بیان کر دیا اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جاتے تو اس کی شرح کی گئی تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی تفسیر کر دی، اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کر دیا تو وہ وسیع ہو گیا۔

قال ابن الاعرابی، الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البیان، والشرح الفهم۔

ابن اعرابی نے کہا، شرح کے معنی ہیں، یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ (طٰہٰ-۲)

اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معنی کے القاء، اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بن مانگے ملی، خدا نے فرمایا۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (انشراح-۱)

کیا ہم نے (اے محمدؐ) تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا۔

شرح صدر اور سینہ کھولنے کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے[1] اس کے لئے عام اصطلاح شق صدر ہے یعنی عالم رویا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینہ مبارک کو وا شگاف کیا، اس کو آب زمزم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینہ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا۔ اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعتاً چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک و صاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و نسائی ابواب معراج و اسرار و فرائض الصلوٰۃ و مسند احمد بروایت انس بن مالک و سنن ترمذی تفسیر سورۃ الشرح۔

بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے، تو بھی یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان و حکمت سے معمور کیا گیا، بہر حال شرح صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورہ بالا معنی کو جو شق صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بھی بحمد اللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ قرآن پاک میں موجود ہے، سورۂ زمر میں ہے۔

أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ (زمر-۳)

بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت موثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا پورا یقین آگیا، اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہو گئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر الٰہی روشنی حاصل ہے یہی شرح صدر کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی و بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ شرح صدر کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں، بلکہ صدر اول کے کلام عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

(۱) پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں، حضرت عمر فاروق آکر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفۂ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچا لیا، حضرت صدیق جواب دیتے ہیں، خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے، نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے، اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیتے تھے، اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا، اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

فو اللہ ماھو الا ان قد شرح اللہ صدر ابی بکر فعرفت انہ الحق (بخاری کتاب الزکاۃ)

تو خدا کی قسم! نہ تھا یہ لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکرؓ کے سینہ کو تو میں نے جان لیا وہی حق ہے۔

(۲) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے، اس وقت حضرت عمرؓ نے آکر حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیا جائے، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، لیکن حضرت عمرؓ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں بھی بات آگئی، اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں۔

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذالک و رایت فی ذلک الذی رای عمر (صحیح بخاری جمع القرآن)

تو عمرؓ بار بار مجھ سے کہتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ دیکھتے تھے۔

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے یہی وہ شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گزرا، نور ربانی یا نور بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی، اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیے، جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے، جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوتا ہے جس کو مفعول بنایا ہے لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا، ایک جگہ قرآن میں ہے یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (روم) "وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں" ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے، عام علم سے نہیں، لیکن دوسری جگہ ہے، هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ "کیا وہ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں" یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں بلکہ مقصود عام علم ہے، تو یہاں معنی یہ ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے، بلاغت کی کتابوں میں هُوَ يَاْمُرُ وَيَنْهٰى وَيُعْطِيْ وَيَمْنَعُ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالئے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کیلئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعین زکوٰۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن میں جس شرح صدر کا ذکر ہے اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیاء علیہم السلام کے سینے کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیاء کو امور دین میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوا اور یہیں سے عام امت اور انبیاء کے فرق مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امور کے سمجھنے کے لئے شرح صدر ملتا ہے اور انبیاء کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان دونوں موقعوں پر لی اور لک ہے حضرت موسیٰ کہتے ہیں "میرے لئے سینہ کو کھول دے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا" سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لئے" کے اضافہ کی ضرورت اور اس "لام" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ حرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے جیسا کہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا میں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجھ کو تیرے لئے ملی ہے یعنی تیرے کشف علم کے لئے یا تابہ کے لئے یا فائدہ کے لئے اور یہ کشف علم اور شرح صدر خود تیری ذات کے لئے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہوا۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کا جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوا، اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا؟ دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو افعال و اقوال اور احادیث و سنن کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیین کتاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے، چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پُرنور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیض یاب ہوں، وہ علی قدر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے اس لئے اس کے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے یہ منصب خلفائے راشدین، اکابر صحابہ، ائمہ تابعین و تبع تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام کو ہمیشہ ملتا رہا، اسی کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یابان علوم نبوت اور حاملین اسرارِ شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے، فرمایا

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝ (قیامہ-۱)

تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے تاکہ تو اس کی (تلاوت و اشاعت میں) جلدی کرے، بے شک ہم پر ہے قرآن کا جمع کرنا اور اس کو پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا تو تو اس کی پڑھائی کی پیروی کر، پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔

اس بیان و شرح کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے، پھر کبھی رسول کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث و سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا، حسب ذیل آیت سے ثابت ہے

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (نحل-۶)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔

بیان اور تبیین کے لغوی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح و تفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ "تبیین" اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہیں، سیاق و سباق اور موقع و محل سے ہو سکتی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے،

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (مائدہ-۳)

اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کر دے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرے۔

یہاں "تبیین" صریح طور سے اخفا کے مقابلہ میں ہے اس لئے یہاں "تبیین" کے معنی یقینی طور پر اظہار و اعلان کے ہیں، لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے،

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً

اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری لیکن اس لئے تاکہ تو واضح کر دے اس کو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لئے

لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (نحل - ۸) رہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح و تشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو وہ آپ کی توضیح و تفسیر کے بعد دور ہو جائے۔ اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیے، جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (نحل - ۶)

اور ہم نے اے پیغمبر! تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا، تو اس کو ان کے لئے کھول کر بتادے شاید کہ وہ سوچیں۔

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح و تفصیل کرنے کے، ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے امر مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے کے نہیں، سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لئے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی، اب جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی، اور آپ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نور حکمت کا فیضان ہوگا، جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے تھے۔

ارحمت انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے جو ایک طرف اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں، پوری طرح حاوی ہو سکے، لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جاسکتا، تاہم ان کو کم کیا جاسکتا ہے، اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرادی، گو انسانی ذرائع حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو گیا، مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے، خلفائے راشدین نے اپنے اپنے عہد میں ان نئے اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لئے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت، نور بصیرت اور ارادت الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوتے تھے اپنا ماخذ قرار دیا، اور یہی اصول بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے اختیار کیا اور نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلۂ نبوی کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں یہاں سے نہ ملیں ان کو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر و استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحی الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلے احادیث و سنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں، وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہ گئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی تو اس کے متعلق بھی وحی الٰہی ناطق ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (نساء-۱۶)	ہم نے اے پیغمبر! تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوجھائے اس کے ذریعہ فیصلہ کرے۔

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تواے پیغمبر اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے، اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو تھا، وہ آپ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورت میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل وانصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو دوڑے ہوئے عدالت نبوی میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا، لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقے سے فیصلہ چاہتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ٭ وَإِن يَكُن لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ٭ أَفِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ٭ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ٭ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ٭ (نور-۷)	اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں، کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں، ایمان والے کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جاتے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا، انہی لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ سے بچ کر چلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (نساء-۹)	تو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں اور
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا (احزاب-۵)	مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔

یہ اطاعت اور مطلق سرافگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکم وقت

اور سلطانِ زمانہ کے لئے نہیں، یا انبیاء کے لئے خاص ہے، دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہمِ نبوت، نورِ نبوت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور ارات (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا، لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحیِ قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کئے کہ آپ کے فیصلے بحکمِ خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے، اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے، ان کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں، اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنھیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کر کے فرماتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ (آل عمران۔ ۱۰۰)

اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیے، در آں حالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں ایک تو آیاتِ الٰہی جو انکو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے ان کو بھٹکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا، اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی، تو رسول کے ذکر کی حاجت، بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی، اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتابِ صامت (قرآن) اس کی کتابِ ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے اور غالباً اس حدیثِ صحیح کے بھی یہی معنی ہیں جس کا اعلان آپ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا۔

انی تارک فیکما الثقلین کتاب اللہ و سنتی

مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں، قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ

انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں، نبوتِ محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے، ایک رسول

جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے، یہ پاک و صاف کرنا آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کا عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت، فیضانِ صحبت، حسنِ اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے بُرے اچھے، بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ بدکار اور گمراہ قوموں میں مبعوث ہوئے، ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا، ان کا یہ وصف تزکیہ وحی والہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش، ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلع نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

نور

اسی لئے نبوت کا سینہ صدق و صفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلع نور ہوتا ہے جس طرح اس کا صحیفۂ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتی ہے، وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے، جس سے اندھے دیکھتے گمراہ راہ پاتے اور ان کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں، خود آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب۔۶)	اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا، خوشخبری سنانے والا، چوکنا کرنے والا، خدا کی طرف اسکے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول کی ذات ہے، سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم و جان، زبان و دل، خلق و عمل، علم و فہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو ان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے، روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی اور جب آپ کی ذاتِ مبارک کی یہ تمام چیزیں انوارِ الٰہی ہیں، تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات و ملکوت کی رویت

جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوتِ سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صلصلۃ الوحی کی سماعت کرتے ہیں، اس طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (انعام۔۹)	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مملکت دکھلاتے تھے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔

استعداد نبوت کی تربیت اور نشو و نما کے لئے یہ رویت و بصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوتی، حضرت موسیٰ کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن و عشق کی مشہور کہانی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہداتِ روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (اسرائیل۔۱)	تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

دوسری جگہ ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰى ۔ أَفَتُمَارُونَهُ عَلٰى مَا يَرٰى ۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰى (نجم-۱)

دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، کیا اس پر اس سے جھگڑتے ہو؟ اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۔ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (نجم-۱)

نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکشی ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ایک اور مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (تکویر)

اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کنارے میں دیکھا۔

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماعِ غیب جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسۂ بصارت کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسۂ سامعت کا خصوصی امتیاز ہے، قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے، وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (نساء-۲۳) اور خدا نے موسیٰ سے بات کی۔

حضور کو حکم ہوا۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (طٰہٰ-۶)

اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو، قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کرو۔

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انھوں نے اس کی آوازیں سنیں نَادَيْنَا ہم نے پکارا، بار بار یہ مضمون قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ ودعوت نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا جس صداقت سے اس نے اس کو آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں، ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس بھٹکانے، بھٹکانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلوؤں میں چبھیں، ان کو رگ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا، اور مال ومنال اہل وعیال، غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور اس کی اس ساری کوشش وکاوش کا مقصد خدا کی رضامندی، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء کی تبلیغ ودعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انھوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار وقربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی بے کسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلاواسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہی کی دعوت وتبلیغ اور جد وجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں، اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، وہ ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (احزاب-۵)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ بس ہے حساب (اعمال) کے لئے۔

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ)

فرعون کے پاس جا کر اس نے سرکشی کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ ان کی حفاظت کا خود شہنشاہ دو عالم ذمہ دار ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ-۱۰)

اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اور تو نے نہ کیا تو اس کے پیغام کے پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا، اور اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔

انبیاء کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں، تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا، عذاب الٰہی کا خوف دلانا اور لوگوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرنا، اور انبیاء کی آمد اس شان سے ہوتی ہے کہ خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو جاتی ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء-۲۳)

یہ سب پیغمبر خوشخبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کیلئے خدا پر کوئی حجت نہ رہے۔

ان سب نے پیغام الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ (اعراف-۹)

میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ (اعراف-۱۰)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا، اور تمہاری خیر خواہی کر چکا لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۔ (اعراف-۱۱)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔

یہ بھی فرمایا کہ:

لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي (ہود-۵)

میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا، میری مزدوری تو اس پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا

لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ (ہود-۳)

میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں، میری مزدوری تو خدا پر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضورؐ کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (ابلاغ) ہے، اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحی الٰہی کی تبلیغ ہے یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو بعینہٖ انسانوں تک پہنچا دینا اس کا کام ہے۔۔۔ اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے نہ اس کا اس کو حق ہے ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہوا ہے جس کے لفظی معنی پیغامبر اور قاصد کے ہیں لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے نبی (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، بشیر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن کرنے والا چراغ) صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، مجتبیٰ (مقبول) مصطفیٰ (برگزیدہ) مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا) مزکی (پاک و صاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعۃ) آمر (حکم دینے والا)، اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف و القاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی داں کو حق حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغامبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا، اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصلی شارع ہے اب اگر رسول کے لئے بھی وحی کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا، اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں، کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے، تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر واضع قانون کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے، یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیغام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طریق خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آتی ہو، جس

کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمت ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے، ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوشخبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں، پیغام الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیات الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں، رہنما و ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے، قرآن میں کئی جگہ ہے۔

إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ (ص، رعد، نازعات) — تو تو صرف ڈر سنانے والا ہے

ایک جگہ ہے۔

إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ (ص۔ ۵) — میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں۔

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سنانے کے سوا رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں

إِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (مائدہ) — ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے مبین اور شارح نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس پیغام کا اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوا لینا نہیں، اور یہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر و انکار اور عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے، قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں ان کا منشا یہی اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے۔

وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔ (آل عمران۔ ۲)	کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا تو ہدایت پائی اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول) صرف پیغام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔

مفہوم بالکل صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں، اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا، اس کا فرض ادا ہو چکا اب خدا جانے اور اسکے بندے جانیں

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔ (رعد۔ ۶)	تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔

اس کی مزید تفصیل سورۂ غاشیہ میں ہے۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ‎۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ‎۝ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ‎۝ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ‎۝ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ‎۝ ثُمَّ إِنَّ	تو (اے پیغمبر!) تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے ان پر داروغہ نہیں لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا، بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے

عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (غاشیہ-۱) — اور ہمیں پر ان کا حساب ہے۔

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان، کارفرما اور فرماں روا بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوالے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (شوریٰ-۵) — تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا، انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔

قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ۝ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (یٰسین-۲) — کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، خدا نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ کہتے ہو، رسولوں نے کہا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بے شبہ تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا، پیغمبروں کا فرض لوگوں سے منوانا نہیں بلکہ ان تک خدا کا پیام پہنچانا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (نحل-۵) — اور مشرکوں نے کہا، اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے اخراکتا ہے، کہ ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے، تو ہمارے پیغمبروں پر کھول کر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے۔

وَإِنْ تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (عنکبوت-۲) — اگر تم جھٹلاؤ تو کیا ہے، تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے۔

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ (مائدہ-۱۳) — رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا، اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (مائدہ-۱۲) — اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو، اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ — کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول پر وہ ہے جس کا بوجھ اس پر

وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (نور-۷)

ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے اور اگر اس کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤگے اور رسول پر نہیں، لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (نحل-۱۱)

اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا تاکہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انھوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر کچھ نہیں ہے مگر کھول کر پہنچا دینا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (تغابن-۲)

اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری، اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

پیغمبر کا قول ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّا اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَيْكُمْ (ہود-۵)

تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے یہاں یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر انکا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے، کوئی حکومت دوسرے ملک کے باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدے لے کر آئے، وہی توحید وہی نبوت وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرسش، اس لحاظ سے انبیاء کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اسی لئے فرمایا کہ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا الاية. یعنی خدا نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جو نوح اور دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے، لیکن انبیاء کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جزو توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں اور ان کی دعوت بھی مفید ہو ان کے اخلاقی وعظ بھی دلپسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے اوتار لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں کیونکہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء-۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کو یہ وحی کی میرے سوا کوئی معبود نہیں، میری ہی پرستش کرو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (نحل-۵)

اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا

اہم ترین جزو توحید نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت

انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش بیان میں بہت کچھ بتایا جاسکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل دعویٰ وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو نہ کہ گواہ۔

انبیاء کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمان بندگی کی یاد دہانی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (اعراف ۔ ۲۲)	اور جب تیرے رب نے بنی آدم کو پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کر کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے گواہی دی کر قیامت کے دن یہ نہ کہو ہم اس کو بھول گئے تھے۔

اس لئے ضرور ہوا کہ ان کو موقع بموقع ان کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا اس لئے فرمایا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء ۔ ۲۳)	رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت اور رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کا مظہر اور مورد ہے اسی لئے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لئے ہادی کا لفظ آیا ہے، فرمایا۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد ۔ ۱)	اور ہر قوم کے لئے ایک راہ دکھانے والا آیا۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ ۔ ۵)	اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (انبیاء ۔ ۵)	اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی تھیں بار بار ہُدیٰ (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو ضیاء اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت و رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگان الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (حدید-۱)

وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے، جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے افراط و تفریط پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا۔

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (رحمٰن-۱)

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالق فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزان شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیئے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے، اور بالارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے، بے ارادہ دنیا کا نام نظام عدل اسی خدائی میزان فطرت سے چل رہا ہے اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت و طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزان شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید-۳)

ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں۔

انبیاء کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لئے ہے، آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پر شور بنا دیا ہے آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک و شبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے لیکن وہمی و خیالی مباحث سے قطع نظر کرکے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو، آج جہاں کہیں بھی سچائی کی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے وہ اسی مطلع خورشید سے چھن کر نکلی ہے کوئی دیندار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحاری کا وحشی، اردمی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو کوئی بھی ہو اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی و بدی کی تمیز سے آشنا ہے تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے، آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف اور تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے بلکہ طبقہ انبیاء ہی کے بے واسطہ یا بالواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی، مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی، نیکوکاری

حسن خلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کو بھی نیکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضان تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بناء پر جو لوگ ذہنی طور پر پیغمبروں کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں، اس لئے انبیاء کا وجود تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے اور قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رَحْمَةً وَهُدًى رحمت اور رہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے اور اسی لئے خاتم نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئی، خدا نے فرمایا۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (انبیاء ۷) — اور ہم نے تجھ کو (اے محمدؐ) تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تائید و نصرت انبیاء علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے، پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے، قرآن نے کہا۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (صٰفّٰت ۵) — اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لئے پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً انہی کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوتا ہے۔

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہی کو اور ان کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیابی ہوگی۔

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ يَوْمَ لَا يَنفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ (مومن ۲) — بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے جس دن گنہگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لئے برا گھر ہوگا۔

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعۃً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آکر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا (یوسف ۱۲) — یہاں تک کہ پیغمبروں کو اپنی قوم کے ایمان سے مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آگئی۔

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت اور حفاظت دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں، مخالفوں کی فوج و لشکر تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فرض سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہر بیچارگی اور

تنہائی کو دیکھ کر، ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوءِ ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ (ابراہیم) سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے اعلان پکارنے والوں ہی کو آخر جیت ہوگی۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (مجادلہ) اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔

خاتمہ اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا۔

فلسفی را از پیمبر واشناس — آبگینہ راز گوہر واشناس
آبگینہ را نہ پنداری بدست — جز دمے کہ گوہرے آری بدست
چوں گہر آمد بدستت شب چراغ — آبگینہ شد سیہ چوں پرِ زاغ
فلسفی اندر بُنِ چاہِ نشر مند — نردباں دارد بخورشید بلند
نردبانش می برد تا چند ارش — پس بخاک افتد نگوں گشتہ سرش
واں پیمبر خود ز بامِ آسماں — رشتہ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتہ جاں را بدیں رشتہ بتاب — پس بر آتا بارگاہِ آفتاب
ز آسماں پیغمبر آوازت دہد — فلسفی از خاک پروازت دہد

ایں نردورت رہ نماید سوئے جاں
واں نخواند خود ترا از کوئے جاں[1]

٭

[1] ماخوذ از دیوان فارسی مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء ص ۱۴۳، ۱۴۴ مطبوعہ مطبع شمسی حیدرآباد دکن۔

شبِ ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت امس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تاریکی میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو، بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی، اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی، جس کے لئے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما چکے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (فتح-۱)

جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔

اسلام یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرہ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، ان ہی کے معبد تھے اور انہی کے ناموں پر بڑے بڑے گرجا، انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو، اور یہ تینوں کے تینوں تجرد و رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مترادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ صدی قبل تزکیۂ نفس کے کچھ درس دیے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی، لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں چراغ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی، لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ نکالا تھا مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسر پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا، حرص و طمع اور کشت و خون کی گرم بازاری تھی نفس انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل و راستی اور پاکبازی و پارسائی کے عطر عنبر

کی خوشبو انسان کے جامہ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیویوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالمگیر تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع انسان کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عہد دراز سے پراگندہ اور منتشر ہو رہا تھا پھر نظم و انتظام پیدا کر دے اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سر نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا تفصیل کے لئے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیئے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت مصر یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانہ پارینہ بن چکی تھی، خود عرب و مضافات عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گذری ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبح سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا میں حکمران تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں بر اعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہنود ہیں۔

مجوسِ فارس

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوج کمال پر تھا مگر عہد بعثت سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سارہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم و ستم اور امراء کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاص اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی، اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزدان و اہرمن اس کے دو خلق اور آگ اس کی مسجود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب نہ ہوا[1]، اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران، برباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے اخلاقی حیثیت سے محرکات کا وجود ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیہ رہا، باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا وہاں کوئی

---

[1] کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی و کتاب الہند و التاریخ مقدسی ذکر فرق مانویہ و تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۰۲۔

غیر معمولی بات نہ تھی، یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اس کو قتل کر ڈالا،[1] عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ ان افسانوں اور منقولوں سے ظاہر ہے جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزء ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آسکتی ہے، عورتوں کی بے وفائی، بداخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امراء درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے جن کو سجدے کئے جاتے تھے، ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا، ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جاسکتی تھی، رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا، جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصہ آستر میں نظر آتا ہے اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے، اس کی تفصیل گبن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اول بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا، قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا،[2] لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ یہ مصیبت نازل ہوئی کہ اس کے عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملک نہیں، بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیئے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہو سکتی تھی، عیش پرست اور ہوس ران امراء اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کیا، اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا،[3] قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہو گیا۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ خسرو نوشیرواں نے لی، ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدولت ملا، مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبانا اور کیش زردشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا،[4] مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زردشتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا،[5]

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا پایہ تخت ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کیسا تھ

---

[1] تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۱۰۲۷، ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے (کتاب الخراج والامارۃ والفئی جلد دوم ص ۲۶)۔ [2] مورخوں کی تاریخ عالم ج ۸ ص ۸۴۔ [3] غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۶۰۰، پیرس، [4] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد ۲۱ ص ۲۲۳۔ [5] غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۹۸ پیرس،

اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تغافل شعاری، امراء کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہی ہوتی گئی یہاں تک کہ سنہ ۶۳۶ء میں مجاہدین اسلام کی فتح مندی کی طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کیلئے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمۂ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی، اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو ان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوتے، یزدان واہرمن نور وظلمت اور خیر وشر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا، اسلام وفارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جاکر اس کے برابر بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا، انہوں نے جواب میں کہا، ہم عربوں میں دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اسی لئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا، مسٹر جان ملکم جن کا مسیحی تعصب عساکر اسلامی کو ان کی زبان سے "قزاقان عرب" کا لقب دلواتا ہے، فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں۔

"یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لئے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن "سوسمار خوار" کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ حقیر ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہوسکتا، مسلمان، فارسی مورخین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ اوہام پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزۂ عظیم خیال کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے خدا نے محمد کی صداقت کو ظاہر کردیا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آجاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر ونحیف ہوچکی ہو جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ وناتواں ہو اور جو اپنی کبرسنی اور نقاہت سے قعر زوال کی جانب غلطیدہ پشت ہو اس کے لئے پرجوش قزاقان عرب کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔"[2]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی وناتوانی، نقاہت وکبرسنی "قزاقان عرب" ہی کی ترقی کی کیوں تمہید بنی؟ کیا نئے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے، جو عراق وایران کے آخر آخر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے، واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی، نور وظلمت، خیر وشر، نیکی وبدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کردی تھی، "یزدان اور اہرمن" کی دوعملی حکومت نے روحانی امن وامان کی سلطنت برباد کردی تھی، بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہوگئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجون مرکب تھا، آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کردیا، نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں بادشاہ عادل وغیرہ کا خطاب بھی پایا، تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

---

۱ تاریخ طبری واقعات سنہ ۱۴ھ ص ۲۰۰، ۲۰۰۱ مطبع بریل ۲ سر جان ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول ص ۱۳۲ ۳ تفصیل کے لئے فہرست ابن ندیم دیکھو ص ۳۴۲ مصر۔

عیسائی رُوم

آغاز اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے، روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی، حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لئے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مرادف بن گیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی سلطنت میں مبعوث ہوکر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سُنا کر رخصت ہوئے، ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں، بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصلی عیسویت ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی اور باپ بیٹے اور روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہوگیا اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے[1] وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے لعنت[2] قرار پائی۔ ۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہوگئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا، تخت سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا، اس کے لئے سیاست مدنی کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوتی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہوگیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکستر آگ بھی زور و شور سے شعلہ زن ہوئی، اعیان سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہوگئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوگیا، بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں منقسم ہوکر مختلف دعویداران حکومت کے حصہ میں آئی، ناقابل فرمانرواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ وندال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کئے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت وحشیوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آرہا تھا کہ ان کے مورث اعلیٰ نے جو بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانے کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا، مورخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے۔

"اس پیشین گوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتناء بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت اور بدقسمتی کا سامنا تھا اہل روم کو یاس آمیز جذبات سے پُر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں، رومن حکومت مخالفوں کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی

---

[1] متی ۵: ۱۷۔ [2] یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا بتصریح مذکور ہیں [3] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم جلد اول ص ۱۸۸، ۴۱۹ [4] گبن کی تاریخ زوال سلطنت روم جلد دوم باب ۳۶ و باب ۳۸۔

جاتی تھی، اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

امراء نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا، جس کے باعث وہ اپنی قلیل کمائی سے بھی محروم ہوگئی، محصول کی عدم ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت وعداوت پیدا ہوگئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر بربر وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی، امراء، وزراء اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے، الغرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں،

"اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال وبربادی سے نہیں بچا سکتی تھی"[1]

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینیوب سے لے کر دجلہ ونیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی، لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسٹینین کے زمانہ (یعنی ۵۲۷ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت منتشر وابتر حالت میں، رعایا کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور امرا واعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح کے جعل وفریب، رشوت ستانی اور لوٹ، ہر کو جائز سمجھتے تھے فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوتے تھے لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فن جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد ورقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی وذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی ومنصب حاصل کرے۔

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہل روم کو ایک دم کے لئے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لومبارڈس، گوتھس، ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گبن کی زبان میں اس کی مثال بعینہ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ وبار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا، خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہوگئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی، اب ویران اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔[2]

---

[1] ایضاً ص ۱۶۱۴ [illegible] ص ۱۶۹ [2] عوالم مذکور ج ۲ ص ۲، [3] گبن ج ۳ ص ۳۸۱۔

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کرکے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے، بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنھوں نے عیسائیت قبول بھی کرلی تھی وہ بھی باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے، حضرت عیسیٰؑ اور مریم و روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کردیئے تھے، جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ وجدل کی نوبت آگئی تھی، یہاں تک کہ ۵۳۲ء میں خود عیسائیوں کے دوگروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ...،۵۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا[1]۔ اس جنگ عظیم کے علاوہ ہر وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بار بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت وخون کی نوبت آجاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا، اس بناء پر محض حب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے، ان پادریوں کے ایک اسقف اعظم سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں، ان کی تفصیل کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے، ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا، اور ان سب کو جلاوطن کردیا، ان کا مال واسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین کے برابر کردیئے گئے[2]، سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا، ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گزر رہا تھا تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اینٹ سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا، سرل کی ایک خاتون دوست ہلیشیا نامی تھی، ایک روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آرہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کردیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اس کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کردیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا[3] یہ واقعات ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے مگر عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی اپنی پناہ ڈھونڈتے تھے نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں انھوں نے اس حقیقت کو واضح کردیا کہ شہزادۂ امنؑ کا مذہب ان جنگجوؤں کے ہاتھوں تباہ وبرباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس جو پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں، اپنی تاریخ ہندوستان میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں،

"اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو نجس کر رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم، روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قعر فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی، یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہو جانے کے بعد پوری شان وشوکت اور شاہی عظمت

---

[1] گبن ج ۳ ص ۲۴۳ [2] ایضاً ص ۲۰۰ [3] ایضاً ص ۲۲۳ نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب وسائنس ص ۱۵۵

حاصل ہوگئی تھی، اور ہر اس تحریک کی مدد کے لئے تیار تھے جو ایسے قابلِ نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے، اہلِ فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پرجوش و ناروادار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے، جنھوں نے ان کے معبود آتش شمسی کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھتے ہوئے معبودوں پر ماتم کر رہی تھی، ان کے انتقام کے لئے آمادہ اور مستعد بیٹھی تھی۔[1]

مارس صاحب واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحت انکو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

بہرحال مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کیلئے باعثِ ننگ ہے، مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا حضرت مسیحؑ کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تکمیل مصر کو قابو میں لانے کے لئے کی گئی، جس سے حضرت مسیحؑ کے وہی ایک ہے کی تعلیم ہمیشہ کے لئے ان کے مذہب سے ہٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ ایک قبر پرستی عام ہوگئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے، ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے، مسیح و مریم، روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔[2]

سیل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"گرجا کے پادریوں (CLERG) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن و محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لئے باعث ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کئے گئے، خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی، ای نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ بغداد کے مناظرات میں مشغول ہوگیا اور ایرینس سلینس نسطوریس اور یوٹیکینس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔ مغربی چرچ میں ڈمیس اور ارسیلی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لئے قتل تک نوبت پہنچادی اور آخر ڈمیس کی فتح ہوئی، اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نیلس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل کئے ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے اس لئے اس ذریعہ سے ان کو گرانبہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی، ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے، جسٹنین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی، اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی تبدیل ہوگئی ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے۔

---

۱ مارس کی تاریخ ہندوستان جو اول ص ۱۸۳۔ ۲ سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ ۳ سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۵، ۲۶۔

عقائد کی خرابی کے علاوہ روم و فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں، شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لئے مشہور تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ لوگوں نے روند ڈالا تھا، یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے انکی قوت کو زائل کر دیا تھا۔[1] رومیوں نے عیسوی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں۔[2] جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ترطلین نے بیان کی ہے، متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا، عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا، مریم عذرا کو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا۔[3]

اسی زمانہ میں ایک گروہ مریمی کے نام سے پیدا ہوا جو حضرت مریم کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلاثہ کے اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کئے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلافات باہمی نہایت شدومد سے پیدا ہوئے یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لئے حکومت کو بار بار دست اندازی کرنا پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا، اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔[4]

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں، مذہبی مناصب کے لئے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لئے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک شب دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے۔[5] اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر حصول مال و منال اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔[6]

سلاطین اور مذہب کے حاملین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی اسراف اور ہوس پرستی، مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بیدردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہو و لعب اور عیاشیوں میں اڑا ڈالتے۔[7]

پادریوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ پر شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس، ڈریپر ص ۶۲ [2] ایضاً ص ۶۵، ۶۶ [3] سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۶ [4] ایضاً ص ۲۶ [5] ایضاً ص ۲۶، ۹۸ [6] تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔

میں لے لئے تھے، جو وہ زمین پر کھول لیتے تھے، وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو بیاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔
انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔

دینداری کا سب سے اہم جزو تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی، ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف و عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھڑی میں بند کر لیا تھا، ماں باپ، عزیز و اقارب، اہل و عیال، دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ کے کانٹے تھے، ان سے پرہیز بلکہ ان سے نفرت کمال تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی باثر مذہب قائم تھا، ایک ہندوستان بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں، ایک اصلی ہندو، ویدک عہد جو دو ہزار سال ق، م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک رہا، دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکما و عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ایک ہزار قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے وید یا گوتم بدھ کی تعلیمات کے پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مورخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے، اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے۔

(۱) شرک جو ابتداء ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا، اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔[1]

(۲) ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہو گئی تھی۔[2]

(۳) مندروں کے محافظین بداخلاقی کے سرچشمے تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے تھے۔[3]

(۴) ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی، لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی جو نظام معاشرت کے لئے تباہ کن تھی۔[4]

(۵) عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا۔[5]

(۶) قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری و حمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا، مثال کے لئے چند قوانین درج ذیل ہیں۔

---

[1] آر سی دت کی ہندوستان قدیم ج ۲ ص ۲۰۷، [2] ایضاً ص ۲۱۰، [3] ایضاً ص ۲۸۳، [4] ایضاً ص ۳۰، [5] ایضاً ص ۳۳،

(۱) برہمن کو کسی حالت میں، خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو، سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھولے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ھ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضاء قطع کر ڈالنا چاہیئے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیئے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیئے۔[1]

(۶) راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالت خمار میں جامۂ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔[2]

(۷) شاہراہوں پر آوارہ گرد جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔[3]

(۸) خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی، جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

(۹) اوہام اور خیالات فاسدہ، بھوتوں، پلیتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون و اوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی، اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا ان کا دھرم تھا، بتوں، دیوتاؤں، دیویوں کا شمار افرادِ قیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانۂ حمد تھا، ظہور اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپسیا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر رحم و افسوس آتا ہے اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں، انہوں نے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں، وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کی رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے۔[4] وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لئے قانوناً محروم کر دی جاتی تھیں، اور اسی لئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ در آتش ہونا پسند کرتی تھیں، لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے، یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مردوں کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے۔[5] اور مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے، شودروں کے نام سے ایک پوری کی پوری قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا، وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی، قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی، عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

---

[1] آر سی دت کی ہندوستان قدیم ص ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴۔ [2] ایضاً ص ۴۴۹۔ [3] دیکھو ابو زید سیرانی کا سفرنامہ ص ۱۱۵، ۱۱۸ پیرس و آثار البلاد قزوینی ص ۸۱۔
[4] سفرنامہ ابو زید ص ۱۳۰ و احسن التقاسیم مقدسی ص ۴۸۳۔ [5] مہا بھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو۔ ستیارتھ پرکاش سمولاس گیارہ ص ۳۵۹، ۳۶۰ مطبوعہ ہیکٹ علم پریس ۱۹۳۶ء

اس مختصر خاکہ سے معلوم ہوگا کہ بعثِ اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اس قوم سے ہو سکتی ہے جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحیِ الٰہی کی امانتدار بنی، اسی لئے قرآن نے ان سے کہا وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ (بقرہ ۵۰) اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الٰہی کے منکر نہ ہو گو یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ سنگدل بھی ثابت ہوتی، اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا، قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا۔

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ ۹) ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا، حضرت موسیٰ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو، چنانچہ قرآن مجید نے کہا

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۚ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔ (مائدہ ۱۱)

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر داؤدؑ اور مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے، منع نہیں کرتے، ان کا کام کتنا برا ہے۔

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لَے میں کیا ہے زبور (۷۸) میں ہے۔

اے میرے گروہ، میری تعلیم پر کان رکھو، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو، تاکہ آنے والی پشت سے وہ فرزند جو پیدا ہوں سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں بلکہ اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سب کے پھر انھوں نے گناہ کئے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا، لیکن انھوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریاکاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے کیونکہ ان کے دل اللہ کے ساتھ قائم نہ رہے کتنی بار انھوں نے بیابان میں اس (خدا) سے بغاوت کی اور وہ ویرانہ میں اسے بیزار کیا، تس پر بھی انھوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بیوفائی کی، وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف چلے گئے۔"

زبور ۸۱ میں ہے۔

اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا، اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کر، خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی زمین سے باہر لایا، اپنا منہ کھول کہ اسے بھر دوں گا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا، تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤدؑ سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے حضرت داؤدؑ نے ان کے متعلق یہ دعا کی کہ

"تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ رہ نہیں سکتا، جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے، تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں، نابود کر دے گا، اے خداوند اپنی صداقت میں میرا راہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر، ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے، اے خدا تو انہیں ملزم جان ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں، ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔" (زبور۔ ۵)

حضرت عیسیٰ نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری قبروں کے مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دینے پر باطن میں ریاکاری اور شرارت سے بھرے ہو۔"

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے، اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، پس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو، اے سانپو، اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔" (متی ۲۳۔ ۲۷۔ ۳۳)

بعینہٖ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے۔

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ (بقرہ۔ ۷)

اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں اس لئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔

قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (بقرہ۔ ۱۱)

کہہ کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو تم پہلے "قتل کرتے رہے"، اگر تم مومن تھے۔

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (آل عمران۔ ۳)

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھاتے تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا، ان کی مذہبی سنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۵۰، ۶۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پُر درد داستان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دلایا۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (بروج-۱)

گڑھے والے لوگ مارے گئے، بھڑکتی آگ کے گڑھے جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے۔

۱۔ ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ-۳)

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ-۹)

اور کہا کہ ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی لیکن چند روز۔

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لئے خاص ہیں، قرآن نے کہا،

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ-۱۱)

کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں، قرآن نے انکے جواب میں کہا،

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (جمعہ-۱)

یہ خدا کی مہربانی ہے وہ جس کو چاہے دے۔

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لئے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (مائدہ-۶)

وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (بقرہ-۹)

تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں، یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے، وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (بقرہ-۹)

اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا علم نہیں لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں، وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے۔

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (بقرہ-۱۲)

جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب پس پشت ڈالتا ہے، گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ

کیا جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش کے موافق نہ ہو تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور

وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (بقرہ-۱۱)

کچھ کو مار ڈالتے ہو۔

ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لاچکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے، بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں، آپ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی جب وہ لائے اور اس جرم کے متعلق حکم کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو ہیچ سے سنگساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتادیا، آپ نے فرمایا خداوندا میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کرے گا (صحیح بخاری و مسلم کتاب الحدود، و ابوداؤد باب رجم الیہودیین)۔

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر اس کو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے دیکھا۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ (بقرہ-۱۰)

پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو، اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

۲۔ دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی، اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (بقرہ-۱۱)

ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے، مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس قدر سختی اور بددیانتی کا برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں، قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہل کتاب کی نسبت فرمایا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ (آل عمران-۸)

کتاب والوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لئے دو، وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو، اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔

توراۃ میں اپنے بھائی کے علاوہ اجنبی سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود سے ذلیل اور اہل

عرب جو یہود رہتے تھے ان سے بہاری بہاری شرح سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علماء ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور ان کے علماء کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (مائدہ-۹)

اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے کرتوت کتنے برے ہیں، ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں باز رکھتے، ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ-۶)

جھوٹ کو سننے والے اور حرام کو کھانے والے ہیں۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء-۲۲)

اور ان کے سود لینے کے سبب حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔

اسی لئے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کر کے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ ان سے ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے، خدا نے فرمایا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (مائدہ-۷)

ہم نے توراۃ اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق نبی جو تابعدار تھے یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے، ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انھوں نے بچا رکھا تھا ان میں سے فیصلہ کرتے۔

اس کے بعد اس کے احکام کے اجراء اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (مائدہ-۷)

اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی لوگ کافر ہیں۔

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے، وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے، قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ (نساء-۷)

اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا ہے وہ تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ، بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (نساء-۸)

کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ، گنڈا، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان کی تعلیم ہے

(بقرہ ۱۳) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کے پھونکتے تھے[1]۔

عرب سے باہر یہودی، یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا، عرب کے اندر جو یہود زمانۂ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے اور غریب عربوں کو اپنے گراں شرح سود اور قرضوں کے بار میں اس طرح دبائے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی، اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا۔

محمد بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقاء جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے، وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے، انھوں نے اس سے کہا، اے کعب! اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو صدقہ وصول کرکے ہم کو دق کر ڈالا، اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں، اس نے کہا خدا کی قسم ابھی معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بیزار ہو جاؤ گے، انھوں نے کہا کہ میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا، انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلٹتی ہے، میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں، اس نے کہا مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے، انھوں نے کہا تم بتاؤ کیا چاہتے ہو، اس نے کہا اپنی بیویاں گروی رکھو، انھوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں کیسے گرو رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں، بولا اچھا تو اپنے لڑکوں کو گرو رکھو، کہا ہم اپنے لڑکوں کو کیسے گرو رکھیں، ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے، ہاں اپنے ہتھیار گرو رکھ سکتے ہیں[2]۔

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی کوئی غیور عورت اگر ان کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی، کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے ورثہ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کرکے زیور اتار لیتے[3]، علماء اور پیشوایانِ دین کی وہی کیفیت تھی، جس کا ماتم اس وقت سے کچھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ نے کیا تھا، لفظی موشگافیوں اور ظاہری دینداری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا، اسلام جو ابراہیم حنیف کے ترانۂ توحید اور طور کی صدائے غیبی کی آواز بازگشت تھا، وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا، وہ کہتے تھے کہ ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہِ راست پر ہیں[4]، اسلام کی اس مصالحانہ دعوت۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ (آل عمران - ۷)

اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی، اس لئے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلے میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ (توبہ - ۵) اپنی دولت و

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب باب السحر ص ۸۵۷، [2] صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف ص ۵۷۶، [3] دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب [3] صحیح بخاری جلد دوم باب من اقاد بالحجر ص ۱۰۱۶ [4] نساء - ۸

ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے یَدُ اللّٰہِ مَغْلُوْلَۃٌ (مائدہ۔۹) خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (البقرہ۔۱۱) ان فقروں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزین تھیں، ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کہ کھو چکے تھے، ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بیتابانہ انتظار کر رہے تھے (البقرہ۔۱۱) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے توراۃ کے صحیفے بھرے تھے اور ان ہی سے سن سن کر یثرب کے اوس و خزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئی سے باخبر تھے۔[1]

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے، جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صبح سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

*

---

[1] سیرت ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا، جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس فٹ تھی تو اس کا پایۂ تخت مآرب اور اس کے اضلاع دفعۃً برباد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ[1] ہے، قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیل عرم کہا ہے، اس سیلاب کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے، جس سے نظام سلطنت میں ضعف آگیا، چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمانروا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا رعایا نے بغاوت کی اور شاہ حبش سے اعانت چاہی اس نے ۵۲۵ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، ۵۷۶ء میں قبیلۂ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا، لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا، اور یمن شاہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی، دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا، اس لئے رفتہ رفتہ عیسائی ہو گیا، اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادیاں تھیں اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے، باقی تمام ملک میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے تھے، لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانۂ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے، آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں اس پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلہ[2] ہے، عرب شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا مثلاً زید اللٰہی، عبد اللٰہی، خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (لقمان-۳)

اور جو تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے تم کہو کہ خدا کا شکر ہے۔

---

[1] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لئے اس کی تعیین میں کئی نظریئے ہیں، ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے، تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اصلیت معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے، آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا (سلیمان)

[2] اکثر علمائے انساب کا بیان ہے کہ یہ قبائل یمن سے گئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں جبرائل اس سے اختلاف کیا ہے (سلیمان)

[3] مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا جز اول ص ۶۶۴ بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

یہ اصل میں حضرت ابراہیم کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں گو اللہ ان سب میں بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ معبودوں کے انکار سے اسی قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں ان ہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر ان ہی خداؤں سے پڑتا تھا اس لئے اللہ کا خیال کچھ یونہی سا رہ گیا تھا ان ہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے ان ہی پر قربانی چڑھاتے تھے ان ہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین و آسمان بنا کر بے کار سا ہو چکا تھا جو کچھ کرتے تھے یہی خدایان اصغر کرتے تھے یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے،

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (سورۂ زمر - ۵)

اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو دفعۃً کھل جاتے ہیں۔

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے خداؤں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش ہوگا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے چنانچہ وہ کہتے تھے

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر - ۱)

اور ہم ان بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔

ملائکہ کی الوہیت

شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں، چنانچہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (نجم - ۲) اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (نجم - ۱)

جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں، تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔

اس لئے جس طرح بعض یہود (حضرت عزیرؑ) کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا (آل عمران - ۸)

اور نہ خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ۔ (زخرف - ۲۰۱)

اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا، بے شک انسان کھلا نافرمان ہے، کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لئے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر برگزیدہ کرے، اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ۔ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ۔ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ (صٰفّٰت۔ ۵)

ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور ان کے لڑکے ہوں، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا اور وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے، خدا نے اس کی تردید میں کہا

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا۔ الآیۃ (نجم۔ ۲)

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے۔

ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (سبا۔ ۵)

پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تم ہی کو پوجتے تھے۔

جنات کی الوہیت

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صٰفّٰت۔ ۵)

اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی۔

اسی لئے وہ جنات کو خدا کی خدائی میں شریک کرتے تھے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام۔ ۲)

انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری ہوئی، چنانچہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے "بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا۔ ۵) بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے۔ مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے، قرآن میں ہے وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (جن) اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی پکارا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا، چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی، ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا، جہاں کے رہنے والے جنوں (سکان الدراہم) پر جانور ذبح کرکے چڑھائے جاتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اعراف)

خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔

بت پرستی

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے، ان کے بت بنا لئے تھے اور جابجا عظیم الشان بتکدے قائم ہو گئے تھے، یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا، اٹھا لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی اس سے زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر نہ نظر آیا، خاک کا ایک تودہ بنا لیا، ایک بکری

لہ صحیح مسلم کتاب التفسیر سہ لسان العرب لفظ سکن تہ کتاب الاصنام ہشام الکلبی مطبوعہ مصر ص ۳۴۔

لاکر اس کا دودھ اس پر دوہا پھر اس کے گرد طواف کیا، اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلۂ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا، ایک دفعہ بلقاء گیا، وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لاکر کعبہ میں نصب کیا، چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا، اس لئے تمام عرب نے بت پرستی قبول کرلی اور گھر گھر بت خانے بن گئے، ان میں ہبل سب سے بڑا تھا، اس سے اتر کر منات، لات اور عزیٰ تھے۔

منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے اور قبائل اس کا حج کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آکر اتارتے تھے، طلعیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبدالعزیٰ مزنی کہتا ہے[۱]

انی حلفت یمین صدق برۃ بمنات عند محل آل الخزرج۔

میں نے مناۃ کی سچی قسم کھائی، اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔

لات قبیلۂ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا، اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔

عزیٰ ایک درخت تھا، اس کے پاس ایک بت تھا، یہ قبیلۂ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے، قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے[۲]

وَاللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنَاۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی، اِنَّھُنَّ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی۔

لات، عزیٰ اور تیسرا مناۃ یہ برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کردیں، جانوروں سے گزر کر انسانوں کی قربانیاں ان پر چڑھائی جانے لگیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحبزادے (عبداللہ) کی قربانی کرنی چاہی تھی، وہ اسی کہنہ رسم کی تقلید تھی۔

بحیرہ، سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے، اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے، بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے ان میں سے ایک پر "ہاں" ایک پر "نا" لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے "ہاں" کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسم کی تھیں، اصنام واوثان، انصاب اور بیوت، اصنام واوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو صنم کہلاتے اور اگر سنگ اور مسالہ سے بنتے تو ان کو وثن کہتے اور انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کرکے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے، بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، ذوالشری، قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے، جن بتوں کے ارد گرد چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی تھی، اس کو عتیرہ کہتے تھے، پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجبہ کہتے تھے، جاہلی شاعر کہتا ہے۔

---

[۱] پوری تفصیل معجم البلدان میں ہے ۔ [۱] معجم البلدان لفظ مناۃ و کتاب الاصنام للکلبی مطبوعہ دارالکتب المصریہ ۱۳۴۳ھ ص ۱۹۔

[۲] نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام ص ۱۱۰ و ۱۱۱۔

کماطاف بالرجمة المعتر[1] جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنے والا طواف کرتے ہیں۔

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی، ان کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ع

قبیلہ قبیلہ کا اک بُت جدا تھا۔

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بُت[2] تھے، ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں، لات، عزیٰ، مناۃ، یغوث، یعوق، نسر، ود، سواع، بعل، لیکن جاہلیت کے پرانے مورخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعرا کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کئے ہیں، ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جو اب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس بتوں کے نام ہیں، علامہ ذکی پاشا جنھوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے، اب تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں، یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں، ان میں المقہ، عشتار، نکرہ، تعیان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں۔

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے۔
لات۔	ثقیف۔
عزیٰ۔	قریش و بنو شیبان بن جابر۔
مناۃ۔	اوس و خزرج اور عام عرب۔
یغوث	بنو مدحج و اہل جرش۔
یعوق۔	بنو ہمدان و اہل خیوان۔
نسر۔	حمیر۔
ود۔	بنو کلب۔
سواع۔	بنو لحیان۔
اساف۔	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
نائلہ۔	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر۔	قضاعہ ولخم وجذام وعاملہ وغطفان۔
باجر۔	ازد وطی وقضاعہ۔
ذوالخلصہ۔	بنو امامہ، خثعم، بجالہ، ازد والسراۃ۔
رُضا۔ یارُضی۔	بنو ربیعہ کا بت خانہ۔
رُمام	حمیر کا بت خانہ۔

[1] ان الفاظ کے لئے دیکھو لسان العرب [2] صحیح بخاری باب فتح مکہ

سبحہ۔

سعد۔	بنی ملکان بن کنانہ۔
سُعَیر۔	عنزہ۔
ذوالشریٰ۔	بنو حارث۔
عائم۔	ازد السراۃ۔
عم انس (یا) عمیانس۔	خولان۔
فلس۔	طی۔
ذوالکفین۔	بنو دوس۔
مناف۔	قریش۔
نُہم۔	مزینہ
ہُبل۔	قریش۔
نُعل۔	قبائل بنی عدنان۔
یعبوب۔	جدیلہ (بنی طی)
اشہل۔	بنو عبدالاشہل۔
اوال۔	بکر و تغلب۔
بس۔	غطفان کا بت خانہ۔
بعیم۔	ایک لکڑی کا بُت۔
بلج۔	ایک بُت۔
جبہ۔	
جُرَیش یا جُبریش۔	ایک بُت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے۔
جلسد۔	ایک بُت کا نام۔
جہار۔	ہوازن کا معبود۔
دار۔	بنو عبدالدار۔
دوار۔	ایک بت کا نام۔
ذوالرجل۔	حجاز کا ایک بت۔
شارق۔	ایک بُت کا نام جس کی طرف عبدالشارق کی نسبت ہے۔
شمس	بنو عبد شمس۔
صدا۔	عاد کا بُت۔

صمودا۔	علاء کا بُت۔
ضمار۔	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ۔
ضیزن۔	منذر اکبر۔
عبعب۔	قضاعہ۔
عوض۔	بکر بن وائل۔
عوف۔	ایک بت کا نام۔
غبغب۔	اس پر جانور ذبح کئے جاتے تھے۔
فراض۔	سعد العشیرہ۔
کثریٰ	جدیس و طسم۔
کسعہ۔	ایک بت کا نام۔
محرق۔	بکر بن وائل۔
مدان۔	عبد المدان۔
مرحب۔	حضرموت۔
منہب۔	ایک بت کا نام۔
ہبار۔	عاد۔
ذات الودع۔	ایک بت کا نام۔
یالیل۔	عبد یالیل۔

ستارہ پرستی عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے، ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے، اسی لئے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (حم سجدہ-۵) نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو دیبی مانتی تھی (نمل-۳) یمن کے بادشاہ شمر یرعش نے سورج دیبی کا مندر بنوایا تھا[1]

سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعریٰ کی بڑی قدر و منزلت تھی، اسی لئے قرآن پاک نے کہا۔

وَاَنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (نجم-۳) اور وہی خدا شعریٰ کا مالک ہے۔

صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسب ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے؛ قبیلہ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم دبران کو، لخم اور جذام مشتری کو، طی سہیل کو، قیس شعریٰ العبور کو اور اسد عطارد کو[2]۔

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے وہ جن، شیطان اور بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے، گو اختلاف صورت اور اشتغال

---

[1] تاریخ الملوک الارض حمزہ اصفہانی ص۱۰۱ کلکتہ۔ [2] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۴۳ بیروت۔

کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے جو اجنۃ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے، ان کا نام غول تھا، یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

جمید بن ایوب الغیری۔

وغولا قفرة ذكر وانثى كأن عليهما قطع البجاد۔

اور بیابان کے دو غول، مرد بھی اور عورت بھی، گویا کہ ان دونوں پر کمل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔

مؤنث کو سعلاۃ کہتے تھے۔

ازل وسعلاة وغول بقفرة اذا الليل وارى الجن فيه ارنت۔

میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو اس میں آواز دیتے تھے۔

عمرو بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوتی تھی، راجز کہتا ہے۔

یا قاتل اللہ بنی السعلاۃ۔

خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے۔

بلقیس ملکۂ یمن (ان کے زعم میں) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی۔

یہ اکثر گیت گاتے بجاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے۔

كم جبت دونك من يهماء مظلمة تيه اذا ما مغنى جنه سمرا۔

کتنی اندھیری گھپ راتوں میں، میں نے صحرا کو قطع کیا، جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی کر رہا تھا۔

یہ صحرانشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے، جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی آگ تاپنے کو آجاتے تھے لیکن جب ان کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے۔

اتوا ناري فقلت منون انتم فقالوا الجن قلت عموا ظلاما دعوت الى الطعام فقال منهم زعيم نحسد الانس الطعاما۔

وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا تم کون ہو؟ انھوں نے کہا ہم جن ہیں، میں نے کہا اس تاریکی میں خوش ہو، میں نے ان کو کھانے کے لئے بلایا تو ان میں سے ایک سردار نے کہا ہم انسانوں کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی، بقار اور عبقر تھے۔

ع؛ جن البدي رواسيا اقدامها۔ — بدی کے جن، جن کے قدم جمے تھے۔

ع؛ تحت السنور جنة البقار۔ — زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے

ع؛ عليهن فتيان كجنة عبقر۔ — اور ان پر شہسوار جوان جو عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔

ان کے اقسام حسب ذیل تھے۔

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے، ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے، ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھالے جاتے تھے، حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے ان کو اٹھالے گئے اور پھر ان کا پتہ نہ لگا، عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھالے گئے، لیکن کئی برس کے بعد جذیمۃ الابرش کو لاکر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھالے گئے، مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا۔[1]

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں سے تابط شرا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور ہیں، طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت کو مار ڈالا تھا، اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں۔

لقیت الغول تسری فی ظلام — میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے میں چلتے ہیں،
فصدت وانتحیت لها بعضب حسام — تو اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار لے کر
غیر مؤتشب یمانی — اس کی طرف بڑھا
فقد سراتها والبرك منها فخرت — تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زرہ جبل کو کاٹ ڈالا اور وہ دو
للیدین وللجوان[2] — دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا

ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا کہ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے، اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلاء تھا

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ — اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا،
وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ — اور ان کے دوست انسان بولے اے ہمارے رب ہم میں
بَعْضُنَا بِبَعْضٍ (انعام-۱۵) — سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔

کہانت

کہانت ایک عجیب بات تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے، اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن رہتا ہے جو وحی ان کو القا کرتا ہے، وہ اپنی شکل و صورت بناتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے[3]، چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گزرا، انھوں نے قیافہ سے پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تربات کیا بیان کی، اس نے کہا میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا،

الم تر الجن وابلاسها ویاسها من بعد — کیا تم جن کی سراسیمگی، ان کی ناامیدی اور ان کے کاروبار کی ابتری
انکاسها ولحوقها بالقلاص واحلاسها — نہیں دیکھتے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ ہے، میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لاکر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا۔

یا جلیح امر نجیح رجل فصیح یقول لا اله الا الله — اے جلیح! کامیاب امر! ایک فصیح شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے۔

---

۱ شمائل ترمذی باب سمر۔ ۲ یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے، اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں دیکھو کتاب مذکور از ص ۱۴۸ تا صفحہ ۱۸۰ جزو ششم مطبوعہ مطبع سعادت مصر۔ ۳ کتاب البیان والتبیین للجاحظ جلد اول ص ۱۱۳ مطبوعہ مطبع علمیہ مصر۔

اس کے چند ہی دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، صحیح بخاری (تفسیر سورۃ والضحیٰ) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات میں عبادت کے لئے نہیں اٹھے اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

انی ارجوان یکون شیطانک قد ترکک۔ میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لئے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے، قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ‎﴿﴾‏ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ‎﴿﴾‏ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ‎﴿﴾ (شعراء)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں وہ سنی سنائی بات القا کرتے ہیں اور اکثر وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے ہیں اور اس بناء پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا ان میں حازی، شق، سطیح، عزی بہت مشہور تھے، جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کئے ہیں۔

والارض والسماء والعقاب والصقعاء واقعۃ للبقعاء لقد نفر المجد بنی العشراء للمجد والسناء۔

قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی، ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنو عشراء پر غالب آگئی ہو برائی اور بلندی کے۔

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف کے مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے اس لئے جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا اور آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا۔

ارایت من لا شرب ولا اکل ولا صاح فاستھل الیس دمہ بطل۔

حضور فرمائیے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا نہ چیخا نہ رو یا اس کا خون معاف نہ ہوگا

آپ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے (صحیح مسلم دیۃ الجنین وصحیح بخاری باب الکہانۃ) یہ کاہن بت خانوں میں بیٹھتے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے، جب لوگ ان سے غیب کی باتیں پوچھتے یا خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے، مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں، یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لئے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے، یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے وہ علانیہ اپنے خدع و فریب کا اعتراف کرتے تھے۔[1] ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا یعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کے لئے تحفہ، اسلام نے آکر اس کو روک دیا۔[2]

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک سینکڑوں قسم کی اوہام پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

شعراء کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے چنانچہ مجمل شاعر کی شیطانہ عمرو کی بیٹی تھی اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا، اعشیٰ خود کہتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۴۳۔ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۸ کتاب البیوع و ج ۲ ص ۸۵۸ کتاب الطب باب الکہانۃ۔

دعوت خلیلی مسحلا ودعوا له بجهنام[1]	میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انھوں نے اس کے لئے جہنام
یدعی للهجین المذمم حیانی	کو پکارا اور یہ کمینہ بد اطوار کے لئے بلایا جاتا ہے مجھ کو میرے جن دوست
اخی الجن نفسی فداؤه من افیح جیاش	نے میری جان اس پر فدا ہو شاموں کے وقت سب سے بڑے جوش
العشیات مرجم۔	مارنے والا اور سخت پتھراؤ کرنے والے کو دیا۔

جو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوتا تھا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا، ابوالنجم کہتا ہے۔

انی وکل شاعر من البشر شیطانه انثی وشیطانی ذکر۔	ہر شاعر کا شیطان تو مؤنث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔

شنقنان اور شیصبان، رؤسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے، ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے۔

ولی صاحب من بنی الشیصبان فطورا	میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے، تو کبھی میں شعر کہتا ہوں
اقول وطورا هوا۔	کبھی وہ۔

اوہام پرستی سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آکر بدلہ لیتا ہے[2]، یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرندہ بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہام کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے، جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرندہ داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے، بحیری کے جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی اس کو چھوڑ دیتے اور وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔

کسی شخص کے پاس جب اونٹوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی ایک آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر بد نہ لگ جائے جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ بکری کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا، سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورا وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے، واپس آکر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی، سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے گا، یہ خیال تھا کہ جو شخص لات وعزیٰ کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے[3]۔ ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے[4]۔

اس قسم کے سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات وخیالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی، ان کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگجوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگجوئی ذرا ذرا سی بات پر لڑ مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسر پیکار تھا، ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذ

---

[1] اعشیٰ کے دیوان مطبوعہ ویانا ص ۹۵ میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرعہ اس طرح ہے جہنام جدعا للهجین المذمم [2] ابوداؤد مطبوعہ مجتبائی جلد ۲ ص ۳۶۶ [3] یہ باتیں بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں [4] مسند دارمی ص ۱۰۵ ج ۱، نیز ص ۴۴۵ ایضاً التمائم جواب حسب۔

10

میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہوکر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا، ان ہی لڑائیوں کو مورخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے۔

هذا الفن لو يتقصا لا لا وحصا فاقتصرت على	یہ فن شمار کا استقصار نہیں کرسکتا اس لئے جو کچھ میں نے بیان
ماذكرت (جلد ۲ ص ۲۷۱ خیریہ مصر)	کیا ہے اسی پر میں نے قناعت کی۔

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی عبس وذبیان کی ہے، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا، ان میں سے ایک فریق نے گھوڑدوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہوپڑی، یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی، دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کے چراگاہ میں جاپڑی، کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کیا، اس بات نے قبیلہ میں آگ لگادی، کلیب جان سے مارا گیا اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی، عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا، چند روز کے بعد موقع پاکر ایک قتل کردیا گیا، اس کے انتقام میں خون کی ندیاں بہہ گئیں، بکر و تمیم میں ایک چراگاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی، اوس وخزرج مدینہ کے دونوں قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں، ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے، اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا، قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے، ایک مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہوجاتا تھا[1]، ان میں لڑنا اور مرجانا اور مارنا جاہلیت کا شرف اور قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی، ان لڑائیوں میں سفاکی، بے رحمی اور قتل وغارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

شراب خوری

شراب جو ہر قسم کے فسق وفجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے، عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میکدہ بن گیا تھا، اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا ان کے نام یاد رکھے گئے ہیں، دوست واحباب کسی گھر میں جمع ہوتے، شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوا کھیلتے، اس میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کرکے کھلا دیتا، کبھی نشہ میں سرشار ہوکر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کردیتا، لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے کھلاتے اور اپنی اس بے جا فیاضی پر فخر کرتے رہتے، سامنے فاحشہ مغنیہ عورتیں گاتی بجاتیں اور وہ اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے، جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے۔

فان تبغنی فی حلقة القوم تلقنی	وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد
پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈھے تو پالے گا	اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے

[1] ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لئے دیکھو عقد الفرید ابن عبد ربہ جلد ۳ اور امثال میدانی لفظ "یوم"۔

متی تاتنی اصبحك كاسا رويه — وان كنت عنها غائبا فاغن وازدد

جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا، اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو گیا ہے تو جا اور بے نیازی کر۔

ندامای بیض کالنجوم وقینة — تروح الینا بین برد ومجسد

میری محفل شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں اور ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔

رحیب قطاب الجیب منها رفیقة — بجس الندامی، بضة المتجرد

اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے، شرابی رفیقوں کی دست درازی سے مانوس اور اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا — علی رسلها مطروقة لم تشدد

جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

وما زال تشرابی الخمور ولذتی — وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار ہے۔

ولولا ثلاث هن من لذة الفتی — وجدك لم احفل متی قام عودی

اور اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں تو تیری قسم، میں اپنی موت کی پرواہ نہ کرتا،

فمنهن سبق العادلات بشربة — کمیت متی ما تعل بالماء تزبد

ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کئے بغیر سرخ وسیاہ رنگ کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب — ببهکنة تحت الخباء المعمد

اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوق سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرنا ہے۔

کریم یروی نفسه فی حیاته — ستعلم ان متنا غدا اینا الصدی

میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کے سیراب کرتا ہے موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔

وبرك هجود قد اثارت مخافتی — بوادیها امشی بعضب مجرد

اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا، جب میں تلوار لے کر چلا۔

فمرت کهاة ذات خیف جلالة — عقیلة شیخ کالوبیل یلندد

تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی جو لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا، قیمتی چیز تھی، سامنے آگئی۔

وقال الا ماذا ترون بشارب — شدید علینا بغیه متعمد

(اور جب میں نے تلوار سے کونچیں کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا) تو اس بڈھے نے کہا کہ اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ہم پر ظلم کر رہا ہے

فظل الاماء یمتللن حوارها — ویسعی علینا بالسدیف المسرهد

تو لونڈیاں اونٹنی کے بچہ کو جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا، بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے کہتا ہے۔

بل انت لا تدرین کم من لیلۃٍ طلقٍ لذیذٍ لھوھا وندامھا

..... بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔

قد بتُّ سامرھا وغایۃ تاجرٍ وافیت اذ رفعت وعزّ مدامھا

میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہوگئی۔

اغلی السباء بکل ادکن عاتقٍ او جونۃٍ قدحت وفض ختامھا

میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم کو خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔

وصبوحِ صافیۃٍ وجذبِ کرینۃٍ بموترٍ تاتالہ ابھامُھا

اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔

بادرت حاجتھا الدجاج بسُحرۃٍ لاعلّ منھا حین ھبّ نیامھا

میں نے شراب کی ضرورت مرغِ سحر کی آواز سے پہلے پوری کی تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرا لوں۔

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انھی عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے:

الا ھبّی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

ہاں اپنا پیالہ لے کر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندرین (شامی گانوں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔

مشعشعۃً کان الحص فیھا اذا ما الماء خالطھا سخینا

پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں، جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔

تجور بذی اللبانۃ عن ھواہ اذا ما ذاقھا حتی یلینا

غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے، اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔

تری اللحز الشحیح اذا اُمرّت علیہ لمالہ فیھا مھینا

تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گزار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔

صبنتِ الکاس عنا امَّ عمروٍ وکان الکاس مجراھا الیمینا

اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف تھا۔

وما شر الثلثۃ ام عمروٍ بصاحبک الذی لا تصبحینا

حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بدتر نہیں۔

کاسٍ قد شربت ببعلبکٍ واخری فی دمشق وقاصرینا

اور کتنے پیالے بعلبک میں پیئے اور کتنے دمشق اور قاصرین میں۔

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا، شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لئے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غایۃ کہتے تھے (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا

یہ ہے کہ تجارت کا لفظ "شراب نوشی" مترادف بن گیا تھا، ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمئہ کہتا ہے:

اذا اسحب الریط والمروط الی ادنی تجاری وانفض اللمم[1]

یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانہ میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔

بدر میں قریش کے دولت مند روسا مارے گئے تھے، ان کے مرثیے میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص و سرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے۔

وماذا بالقلیب قلیب بدر من القینات والشرب الکرام[2]

بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں)، ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے، یہ شعر اوپر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

صبنت الکاس عنا ام عمرو — اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹا لیا

وکان الکاس مجراھا الیمینا — حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کم سنی میں یہ سنا کرتا تھا۔

اِسْقِنَا کَاْسًا دِھَاقًا "شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلاؤ"

صحیح بخاری کتاب الاشربۃ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی ہے تو اس وقت ایک مجلس قائم تھی جس میں حضرت ابو دجانہؓ، ابو طلحہؓ، سہیل بن بیضاء شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کم سن تھا ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا، شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے اور کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت[3] سے ہوگا، جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی، خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی، حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے، ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھاس کا نام ہے) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں، اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لئے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے لوگوں سے پوچھا یہ کس کا کام ہے، معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہؓ چند انصاریوں کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا۔

الا یا حمز للشرف النواء — اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لئے۔

حضرت حمزہؓ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لئے، حضرت علیؓ نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اوڑھی اور حضرت علیؓ اور زیدؓ کو لے کر حضرت حمزہؓ کے پاس گئے، حضرت حمزہؓ مخمور تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ جلد اول ص ۵۵۸ [2] ایضاً باب ایام الجاہلیۃ جلد اول ص ۵۴۱ [3] صحیح بخاری کتاب الغزوات غزوہ بدر ص ۵۷۰

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہؓ نے ۳ھ میں شہادت پائی ہے، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا کس طرح وہ مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنائے اور اشارے سے گزر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی، لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابوداؤد کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا، اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے۔ ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء۔

اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کر دے

اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اتری۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ ۔ ۲۷)

لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں لیکن فائدہ سے گناہ بڑھ کر ہے۔

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے، یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا، ایک صاحبؓ نے امامت کی مگر نشہ کے، نماز میں يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کے سورہ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے، اس پر یہ آیت اتری،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔

۱؎ شراب کی حرمت کی یہ تدریجی صورت حضرت عمرؓ (ترمذی تفسیر مائدہ، ابوداؤد کتاب الاشربہ)، حضرت ابوہریرہؓ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۱) اور حضرت علیؓ (ابوداؤد کتاب الاشربہ) سے مروی ہے۔ یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنھوں نے نشہ کی حالت میں غلط ملط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتی، ایک روایت میں حضرت علیؓ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمن بن عوفؓ کا نام اور تیسری میں کوئی صاحب مذکور ہے۔ حضرت الاستاذ نے سیرۃ جلد دوم (تاریخ احکام ذکر حرمت شراب) میں ابوداؤد کتاب الاشربہ کے حوالے سے حضرت علیؓ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن ہے۔ ابو عبدالرحمن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے، اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آتی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالت نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے، چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ ہیں۔

وہ روایتیں جن میں حضرت علیؓ کا نام ہے۔

۱۔ عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمن بن عوف طعاما فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت

ابو جعفر رازی نے عطا بن سائب سے، عطاء نے ابو عبدالرحمن سلمی سے ابو عبدالرحمن سلمی نے حضرت علیؓ بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی جس سے ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے:
لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) الصلوٰۃ فقدمونی فقرأت قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ماتعبدون فانزل اللہ یا ایہا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکارٰی

(ترمذی تفسیر نساء)

کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ ، لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو)

۲۔ عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن السلمی عن علی علیہ السلام ان رجلا من الانصار دعاہ وعبد الرحمن بن عوف فسقاھما قبل ان تحرم الخمر فامھم علی فی المغرب فقرأ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ فخلط فیہا فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکارٰی حتی تعلموا ما تقولون۔

(ابوداؤد کتاب الاشربہ)

۲۔ سفیان نے عطا بن سائب سے عطا نے عبد الرحمن سلمی سے ابو عبد الرحمن سلمی، حضرت علی علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبد الرحمن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی، پھر علیؓ نے نماز مغرب کی امامت کی اور قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کردیا، اس پر آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکارٰی حتی تعلموا ما تقولون۔ نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ جب تک کہ جو کچھ کہتے ہو اس کو جان لو۔

وہ روایتیں جن میں عبد الرحمن بن عوفؓ کا نام ہے۔

۳۔ عن سفیان عن عطا بن السائب عن ابی عبد الرحمن السلمی عن علی رضی اللہ عنہ قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبد الرحمن ابن عوف وصلی بھم المغرب فقرأ قل یا ایہا الکافرون فالتبس علیہ فنزل لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکارٰی (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۳۔ سفیان نے عطا بن سائب سے عطا نے ابو عبد الرحمن سلمی سے ابو عبد الرحمن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبد الرحمن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور قُلْ یا ایہا الکفرون پڑھی لیکن اس میں خلط ہوگیا، اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکارٰی الآیۃ۔ نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

۴۔ سفیان بن عطا بن السائب عن بن (؟)... عبد الرحمن عن علی رضی اللہ عنہ انہ کان ھو وعبد الرحمن ورجل آخر یشربون الخمر فصلی بھم عبد الرحمن بن عوف فقرأ قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ فخلط فیہا فنزلت لا تقربوا

۴۔ سفیان نے عطا بن السائب سے عطا نے ابن عبد الرحمن سے ابن عبد الرحمن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبد الرحمن ابن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبد الرحمن بن عوف نے نماز پڑھائی اور قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا، اس پر یہ آیت

عمرؓ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعد وقاصؓ کی دعوت کی، اس میں شراب کا دور بھی چلا، پی پی کر مستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی، اس پر حکم آیا (صحیح مسلم فضائل سعد وقاصؓ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) الصلوٰۃ الخ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

اتری لا تقربوا الصلوٰۃ۔

۵۔ خالد بن عبد اللّٰہ عن عطا بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن ان عبد الرحمٰن صنع طعاما فدعا ناسا من اصحاب النبی صلعم فیھم علی بن ابی طالب رضی اللّٰہ عنہ فقرأ قل یایھا الکافرون ولا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ، الآیۃ۔ (مستدرک حاکم، کتاب الاشربہ)

۵۔ خالد بن عبد اللہ، عطاء بن سائب سے عطاء ابی عبد الرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے چند لوگوں نے کہ جن میں علی بن ابی طالبؓ بھی تھے بلایا پھر انھوں نے قل یایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم پڑھی، اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ الآیۃ۔

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں۔

(۶) سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن عن علی رضی اللّٰہ عنہ قال دعانا رجل من الانصار قبل تحریم الخمر فحضرت صلوٰۃ المغرب فتقدم رجل فقرأ قل یایھا الکافرون فالتبس علیہ فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ۔ الآیۃ۔ (مستدرک حاکم تفسیر نساء)

۶۔ سفیان، عطاء بن سائب سے، عطاء ابو عبد الرحمٰن سے وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا، تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا، نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ (الآیۃ)

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں۔

(۱) پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبد الرحمٰن بن عوفؓ تھے، دوسری، تیسری اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے، چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؓ تھے، جنھوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری، چوتھی اور پانچویں میں ہے کہ وہ عبد الرحمٰن بن عوفؓ تھے اور چھٹی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

(۳) اور روایتوں میں ہے کہ وہ اس دعوت کی مجلس میں شراب بھی، چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمت شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں، تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے، خصوصاً اس آیت کے بعد قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ (کہدے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں جو ناقابل تطبیق ہیں، ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے جب ان کے راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابو عبد الرحمٰن سلمی جن کا نام عبد اللہ بن حبیب ہے، وہ پہلے حضرت علیؓ کا طرفدار حامی شیعہ تھا، بعد کو عثمانی (یعنی امیہ کا طرف دار) اور حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا، پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علیؓ سے سنا ہے، محدثین میں مسلم نہیں، بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے، روایت

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (مائدہ ۱۰)

اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو تاکہ فلاح پاؤ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے دوسرے راوی عطا بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا اس لئے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی بھی جاتی تھیں مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو کر خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابل تطبیق اختلاف موجود ہے ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آگیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے، نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں غلط ملط پڑھ دیں، چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لئے یا تو ابو عبدالرحمٰن سلمی عثمانی نے فرقہ واری کے جذبہ میں یا عطا نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت اِدھر سے اُدھر کر دی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے۔

۷ عن ابی هريرة قال حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يشربون الخمر ويأكلون الميسر فسألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم عنهما فانزل الله على نبيه صلى الله عليه وسلم يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا الآية فقال الناس ما حرم علينا انما قال فيهما اثم كبير وكانوا يشربون الخمر حتى اذا كان يوم من الايام صلى رجل من المهاجرين امّ اصحابه فى المغرب خلط فى قراءته فانزل الله فيهما آية اغلظ منها يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وكان الناس يشربون حتى ياتى احدهم الصلوٰة وهو مغلق ثم انزلت آية اغلظ من ذلك يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ فقالوا انتهينا ربنا (مسند احمد جلد ۲)

۷ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی يسئلونك عن الخمر والميسر قل فيهما اثم كبير ومنافع للناس واثمهما اكبر من نفعهما الآية لیکن لوگوں نے کہا خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے، اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قرأت میں خلط کر دیا، اس لئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ، اب بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا، تو بیہوش کی حالت میں جاتا تھا، پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی، يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ اب لوگوں نے کہا کہ خداوندا ہم باز آئے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری ہے حضرت ابو عبیدہؓ امین اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے، ابو طلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا، ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انسؓ سے زبانی روایت ہے۔

کنت اسقی اباعبیدۃ وابا طلحۃ وابی بن کعب فجاء ھم آت فقال ان الخمر حرمت۔

میں ابو عبیدہ اور ابو طلحہ اور ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ شراب حرام ہوگئی۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ ابن جبلؓ بھی شریک تھے، اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی، اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے۔ تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کردی کسی نے پوچھ گچھ تک نہ کی اور دفعۃً جام وسبو توڑ ڈالے، یہ صرف ابو طلحہؓ کے گھر کا حال نہ تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہ گئیں، بخاری باب المظالم میں ہے۔

فجرت فی سکک المدینۃ۔

مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہوگیا تھا، عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لئے جوا بھی انہی کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے۔

أعَیَّرتنا البانھا ولحومھا وذلک عار یا ابن ریطۃ ظاھر

کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں اے ابن ریطہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔

نعاب بھا اکفاءنا ونھینھا ونشرب فی اثمانھا ونقامر

ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس میں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر بھی نہیں، حضرت علیؓ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں، محدثین میں حاکم نے مستدرک میں پچھلی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہوجاتی ہے جس کو خود علیؓ روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں۔

وفی ھذا الحدیث فائدۃ کثیرۃ وھی ان الخوارج تنسب ھذا السکر وھذہ القراءۃ الی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب دون غیرہ وقد براہ اللہ منھا فانہ راوی ھذا الحدیث (مستدرک تفسیر نساء ج ۲ ص ۳۰۷)

اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے اس نشہ اور اس غلط قرأت کو امیر المؤمنین علیؓ بن ابی طالب ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کردیا کہ وہی حدیث کے راوی ہیں۔

درحقیقت واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن خنانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علیؓ کو صاحب واقعہ بنایا۔

لہ فتح الباری جلد (۱۰) مطبوعہ مصر طبع اول ص ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم۔

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیتے تھے جن کے نام یہ ہیں۔ فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلی، منافس، منیح، سفیح، وغد۔ ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لئے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے، جن جن کے حصے مقرر تھے، وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے ان کو ناکامیابی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لئے قماربازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو برم کا خطاب دے رکھا[1] تھا، جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے، ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے۔

واذا ہلکت فلا تریدی عاجزا غسا ولا برما ولا معزالا

اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔

جوئے کی ایک صورت جس کو رہان کہتے تھے یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی جو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے، چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لئے چھ برس کی مدت مقرر کی، چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رومیوں کو فتح و ظفر نصیب نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کو بازی ہار جانا پڑی[2]۔ رفتہ رفتہ اس قماربازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بی بی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے[3]۔ یہ قماربازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی، عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قماربازی کا نتیجہ تھی، حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقے سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سود خوری

عرب میں سود خواری کا عام رواج تھا تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سود خواری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے انہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمانؓ اور خالدؓ بن ولید سود پر قرض دیتے تھے، مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل اور حبیب بن عمیر نہایت دولت مند تھے، بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (بقرہ-۳۸)

مومنو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔

---

[1] یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۲۱ میں ہے۔ [2] ترمذی ص ۱۶۰ جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔ [3] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۲۱

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لئے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے چنانچہ[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خواری ترک کریں گے[2] اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے اور اس راس المال کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کر دیتے تھے، جب میعاد گزر جاتی تھی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے تھے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا دیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک متعینہ معینہ کے لئے کسی کو مثلاً سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گزر جاتی اور تقاضا کرنے پر مدیون ادا رقم کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائیداد مستغرق ہو جاتی تھی یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشت کاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشت کاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آل عمران-۱۳۰)

مسلمانو! دونا، چوگنا، سود نہ کھاؤ، اور خدا سے ڈرو، یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اگر راہن میعاد کے اندر مال مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا[3]، مال و دولت سے گزر کر عورتیں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے تھے۔[4]

لوٹ مار عرب میں رہزنی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو غارت گر اور رہزن بنا دیا تھا، تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص جتھے قائم ہو گئے تھے جنھوں نے رہزنی کو اپنا ذریعہ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا، اس قسم کے لوگوں کو لصوص کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی، وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قبیلے گزرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا، اس کا استیصال صرف ایک پرزور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضر موت کا سفر کرے گی، تو چونکہ وہ قبیلہ طے کے ایک رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا، اس لئے ان کو تعجب ہوا کہ ہمارے طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے؟

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل و عیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا، تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان سے بسلامت گزر نہیں سکتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا، چنانچہ "صبح" کا وقت جب کہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے، اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صبح کا وقت عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور سے

[1] فتوح البلدان بلاذری فتح طائف [2] ابوداؤد کتاب الامارۃ [3] موطا امام مالک ص ۲۰۴ [4] بخاری قتل کعب بن اشرف۔

بولا جاتا تھا، کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے، ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے۔

یالھف زیابة للحارث الصابح فالغانم فالائب

اے زیابہ کا افسوس حارث کے لیے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے، لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پاکر اسی طرح تصرف کرتا تھا، اس لئے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے، بدوؤں میں چوری کا رواج بھی تھا، مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے اور تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جاکر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرا شہرت عام رکھتے تھے، تابط شرا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا تھا، اس لئے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتاتے ہیں، جنھوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرالیا تھا، بلکہ اس کے لئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے[1]۔

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہوگئی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے، دوسری باتوں کے ساتھ یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ آئندہ وہ چوری نہ کریں گے[2]، بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا[3]۔

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کرلئے تھے، ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا (محجن) لگا رکھا تھا، حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا[4]۔

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے، اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے چنانچہ اسلم غفار مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے[5]۔

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لئے اس کے لئے غیر و بیگانہ کی تخصیص نہ تھی، بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب، ہمسایہ دوست و آشنا، خاندان، غرض سب پر پڑتا تھا، چنانچہ مدینہ میں بشر، بشیر، مبشر تین آدمی تھے جن کو بنی ابیرق کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا، یہ لوگ نہایت تنگدست اور فاقہ مست تھے، انھوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالاخانہ سے جس میں ہتھیار (تلوار اور زرہ وغیرہ) بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی، آپ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے، لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کردیا اور بشیر

---

[1] شرح فتح الباری جلد ۱۲ ص ۷۷ [2] کتاب المعارف ابن قتیبہ [3] صحیح بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۳، ۱۰۰۴ [4] سورۂ ممتحنہ رکوع ۲ [5] مسلم باب فی صلوٰۃ الکسوف [6] مسلم و بخاری کتاب المناقب باب اسلم و غفار۔

بھاگ کر مشرکین سے جاملا۔[1]

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لئے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ وَلَا يَسْرِقْنَ (ممتحنہ۔۲) یعنی وہ چوری نہ کریں گی، شرفاء اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیئے جاتے تھے اس لئے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی؛ چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زید کو منتخب کیا جن کو آپ بہت پیار کرتے تھے، انہوں نے سفارش کی تو آپ نے فرمایا تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ گذشتہ قومیں صرف اسی لئے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔[2]

خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ایک چادر کے لئے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا، آپ نے فرمایا میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔[3]

سفاکی و بے رحمی و وحشت

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔ زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے، مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ ڈال دیتے ان کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔

کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پانی بند کر دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اس طریقہ سزا کا نام ان کے یہاں "صبر" تھا، مُردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو بَلِیّہ کہتے تھے۔

زنا اور فواحش

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کئے جاتے تھے، امرؤ القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا، اس کے ساتھ شاہزادہ اور والی ملک بھی تھا، اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور اور عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں اپنے قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں، باوجود اس کے کہ اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

---

[1] ترمذی ص ۴۹۳ کتاب التفسیر سورۂ نور [2] بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۳ کتاب الحدود [3] دار قطنی ص ۲۴۲ کتاب الحدود

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپے چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں۔[1] فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھی رہتی تھیں اور صاحب الرایات کہلاتی تھیں، ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی، اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں، ان میں سے ایک کا نام عناق تھا، مرثد غنوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کرلوں، اس پر یہ آیت اتری ؎

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ (نور۔۱)
اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جاکر کچھ کما لائیں اور ان کی نذر کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے، عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں، ایک کا نام مسیکہ اور دوسری کا نام امیمہ تھا، وہ ان دونوں کو زناکاری کرنے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی آیت اتری ؎

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ (نور۔۴)
اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں، جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں، مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے، جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے۔ اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سربازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے، عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے، صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت معینہ کے لئے نکاح کر لیتے تھے، اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے، اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا، پھر ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی

شرم و حیا کا وجود نہ تھا، حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا باقی سب مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیدیتا کہ ستر عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں۔

---

[1] طبری آیت محصنت غیر مسافحات ج ۵ ص ۱۳ مصر۔ [2] صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ ص ۲۶۹۔ [3] ابو داؤد کتاب النکاح، صحیح مسلم باب التفسیر۔

اليوم يبدو بعضه او كله — آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا جو کھلا ہے اس سے لطف
فما بدا منه فلا احله — اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے۔
نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے، کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے[1]۔
پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے[2]، جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے[3]،
سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کر کے ان کو بیوی بناتے۔

عورتوں پر ظلم عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہے، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدان جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آجاتیں اگر صلح ہو جاتی اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے، بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اس کو اشعار میں ظاہر کرتے، بنو ضبہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدان جنگ میں رسوا کیا، فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فظلت وظلت یرکبون ھبیرھا — تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے اور کوئی اگر پردہ بیچ میں
ولیس لھم الا عوالیھا ستر — تھا تو وہ صرف نیزے تھے۔

قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا وہ رحرحان کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت جریر کہتا ہے۔

نکحت نساءھم بغیر مھور۔ — ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔

عمرو معدیکرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا

امن ریحانۃ الداعی السمیع یؤرقنی — کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے جس نے مجھ کو
واصحابی ھجوع اذا لم تستطع امرا فدعہ وجاوزہ — بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں، اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو
الی ما تستطیع۔ — تو اس کو چھوڑ کر وہ کرو جو کر سکتے ہو۔

طلاق کے لئے کوئی مدت اور حد نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے، عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی، نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی، غیلانؓ بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں، وہب اسدیؓ نے اسلام قبول کیا تو آٹھ بیویاں ان کے عقد نکاح میں تھیں[4]۔

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے، باپ مر جاتا تو اس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں کے) تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔

---

[1] نسائی باب الاستتار عند الغسل [2] ابو داؤد [3] ابو داؤد کتاب الطہارۃ [4] ابو داؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جاتے، خوشبو وغیرہ قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی، اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی، وہ مینگنی کو پھینک دیتی، اسی وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی۔[1] عورت کا جو مہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا، عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہ مشق تھی، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی، اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں میں چھپتا پھرتا۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۔ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ (سورۂ نحل - ۷)	اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کرے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔

ابوحمزہ ایک رئیس تھا، اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی۔

مالابی حمزۃ لا یأتینا	ابوحمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا۔
یبیت فی بیت التی تلینا	اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔
غضبان الا نلد البنینا	اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے۔
تاللہ ما ذاک بایدینا	خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔
ونحن کالزرع لزارعینا	ہم بطور کھیت کے ہیں۔
تنبت ما قد زرعوہ فینا	ہم میں جو بویا جائے گا وہی اُگے گا۔

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی، لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر گڑھا کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے، اس کو عربی میں وأد کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں۔[2]

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے[3]، عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی، وہ اگر آکر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مدخولہ بن جاتی۔[4]

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب احداد المتوفی عنہا زوجہا۔ [2] تفسیر ابن جریر و ابن کثیر سورۃ وَإِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔ [3] تفسیر یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین۔ [4] تفسیر ولا تعضلوھن۔

۱۱

وحشت وجہالت حرام وحلال کی کوئی تمیز نہ تھی، ہر چیز اور ہر جانور کھا سکتے تھے، کھاتے تھے، حشرات الارض عام غذا تھی، چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ کھانا عام بات تھی، چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کا ٹکڑا کھا لیتے تھے، گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے تھے، گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ میمون جس نے آغاز اسلام کا زمانہ پایا ہے اور اہل عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یہ ہیں۔

وایاک والمیتات لا تأکلنّہا	ولا تأخذن سہما حدید النفصدا
مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا	اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا
وذا النصب المصوب لا تنسکنہ	ولا تعبد الاوثان واللّٰہ فاعبدا
اور نہ کھڑے کئے ہوئے بتوں پر قربانی کر	اور نہ بتوں کی پوجا کر، بلکہ اللہ کی عبادت کر
ولا السائل المحروم لا تترکنہ	لعاقبۃ ولا الاسیر المقیدا
اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کیلئے سست چھوڑ	اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو
ولا تسخرن من بائس ذی ضرارۃ	ولا تحسبن المرأ یوما مخلدا
اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر	اور نہ کبھی یہ سمجھ کر آدمی ہمیشہ رہنے والا ہے
ولا تقربن جارۃ ان سرہا	علیک حرام فانکحن او تابدا
اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر	وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر اور یا کنوارہ رہ جا

*

۱۔ اسباب النزول سیوطی آیت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ ۲۔ تفسیر طبری سورۂ مائدہ بیان ماکولات۔
۳۔ صحیح نسائی کتاب الصید والذبائح ۴۔ دیوان اعشیٰ مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص ۱۰۳۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں، جو دنیا کی تمام قوموں میں ان ہی کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی ان ہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلاقِ فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا۔

صحتِ نسب ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے، شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے ان کی تردید کی ہمت نہیں کی تورات نے حضرت ابراہیم کی جن اولادوں کے نام بتلائے ہیں ان میں سے ایک ایک کا نام سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے چنانچہ ریورنڈ فارسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے، اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں، قدیم یہودی مورخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے[1] اور آجکل ایک یہودی ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں[2]، اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لئے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے[3] اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا ہے۔

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ (حج) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

حضرت ابراہیم تک نام بنام سلسلۂ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرزِ معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیم اور ان کے اہل و عیال کا نظر آتا ہے، اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے، وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے وہی رسم و رواج ہیں، جن کو اسلام نے آکر اور زیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ، حج و قربانی کی عادتیں ہیں، اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے، مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے

"اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے[4]۔"

---

[1] ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اول ص ۲۵ [2] تاریخ الیہود فی بلاد العرب لاسرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد مصر صفحہ ۷۵،۷۶۔

[3] سینٹ پال گلیتوں کے نام باب ۴۔ ۲۵ [4] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون "السنہ سامیہ" میں نے ارض القرآن جلد اول ص ۱۰۲ سے ص ۱۱۶ تک اس پر مفصل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے یکجا کر دیئے ہیں۔

اہل عرب کو اپنے حسب و نسب کی حفاظت کا جو خیال و لحاظ تھا اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا، اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے، قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلۂ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے، یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیمؑ ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔ نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لئے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لئے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں مثلاً وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا، مجوسیت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی، یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کے حدود تک پھیلی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی، مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا، عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لئے اپنے مذہب کا نام دین حنیفی رکھتے تھے، یہ سب اسی لئے ہو رہا تھا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلا رہے۔

محکوم نہ تھے

عرب کا ملک تخلیق عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و زبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران و روم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنی حرص و آز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں، گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی، مگر قدرت الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا، یہ تمام اہتمام و انتظار اس لئے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کار آمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے، یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے، وہ اُمّی تھے تاکہ ایک اُمّی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے، پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا، اس لئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار پھر ادھر جزائر ہند، جاوا، سماٹرا اور چین تک ان کا گزر ہوا اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا، یہ تمام مواقع اس لئے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لئے مناسب مرکز تھا، فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتا تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا، پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا ان دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لئے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی، جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کر کے اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا بآسانی ممکن ہوا۔

بعض اخلاقی خوبیاں

ان کے علاوہ اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لئے شاہد نمونہ اور مصلح ہونے کے لئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں، ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علمبردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے، وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے، یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوتے اور کسریٰ و قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پرجوش تھے

ساتھ ہی وہ پُرجوش بھی تھے، اس لئے جس دعوت و تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا، ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لئے بحر و بر دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزم راسخ سے ارکان عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری کے ساتھ ان کا دل شجاع اور بہادر تھا، جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر ہوتی تھی، اہل مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی، یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست، اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے، اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیۂ عقل و دانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، ابو عبیدہؓ بن الجراح وغیرہ سینکڑوں، ہزاروں صحابہ نے علم و مذہب، اخلاق اور سیاست میں نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انھوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے، ان کے شعراء کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں، ان کے فصحاء کے مقولے سنیئے تو ان کی فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گوہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قویٰ بیکار رہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قویٰ کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے، اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں عرب کے بعض قویٰ بیکار رہ جاتے تھے وہ ان کو اپنی یادداشت کے لئے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا یہی سبب ہے کہ ان کے شعراء اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے۔ تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہاں ہی کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے، اہل عرب کی ان خصوصیات نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیاض تھے

اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے، اپنی شہرت اور ناموری کے لئے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا، جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسۂ دعوت میں اڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی صفت تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ طبع میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات زکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ہوتے تھے اور نہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اس لئے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بیباکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے، اہل عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی، مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے

اہلِ عرب کے فطری اخلاق وکردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے اور اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آرا اور نظریہ باز نہ تھے وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون وچرا اور کیسے کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کرکے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے یہی سبب ہے کہ حکیمانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے، وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے، اسی بناپر شارع علیہ السلام نے ان کے سامنے عملی مذہب کو پیش کرکے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا، دور دور سے بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے اور بحث وحجت اور مناظرہ وقیل وقال کے بغیر فرائض واخلاق کی عملی تعلیم حاصل کرکے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیتے تھے وہ اگر مگر اور ممکن وناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے، وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کرکے دینی ودنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے تھے، اہلِ عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت ونظریت سے اس کو پاک ومبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب ومشرق، شمال وجنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا،

ان اوصاف کی مصلحت

اہلِ عرب کے ان تمام فطری وطبعی اوصاف واخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لئے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لئے منتخب ہو چکی تھی، باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے یہ چند اچھے اوصاف اس لئے ان میں ودیعت کئے گئے تھے تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد واعانت کے لئے خزانۂ غیب کا کام دے یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند وعجم میں تھا نہ روم وفرنگ میں، نہ ترک میں تھا نہ زنگ میں تھا، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لئے اسی قوم کو برگزیدہ کرکے یہ امانت اس کے سپرد کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی اولاد میں اسمٰعیل کو پسند کیا اور اسمٰعیل کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو، ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں عبد المطلب کے بیٹے عبد اللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سب سے بہتر نسل میں رکھا، ان کو دو حصوں (عرب وعجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصہ میں (یعنی عرب میں) بنایا جو سب سے بہتر تھا، اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا، پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔[1]

*

۱؎ یہ دونوں حدیثیں ترمذی باب المناقب میں ہیں ۱۲۔

صبحِ سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اسی ظلمت میں تھی کہ صبحِ سعادت نمودار ہوئی اور خورشیدِ نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا، ظلمتِ شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پُرنور ہو گیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا، اس لئے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعت کامل عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لئے ابد تک کافی ہے، لیکن کوئی شریعت کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات ہر ادا، ہر جنبش عملی خطیب بن کر گردوپیش کو اپنا ہم زبان اور اپنا ہم عمل بنا لے۔

اس بنا پر خاتمِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لئے تیار کرنا تھا، دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں، ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار و ذلیل ہے، اِنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (ہم نے تم کو تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت دی) کا تاج پہن چکی تھی، لیکن اوپر تفصیل گزر چکی کہ اب تمام قوموں کا مادہ مفقود ہو چکا تھا، ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا، رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے، ہندوؤں کا دل و دماغ وہم پرست ہو کر رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادۂ نشو و نما سے لبریز تھا اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا، مشیتِ ایزدی نے اسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل، سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ بن چکا تھا، کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ[2] کا مظہر بن گیا۔

ان لوگوں کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا　　ایسے لوگ کہ ہم اگر ان کو دنیا میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔

یدعو قوما الی السنۃ الراشدۃ و یزکیھم و یصلح شانھم ثم یتخذھم بمنزلۃ جوارحہ فیجاھد بھم اھل الارض و یفرقھم فی البلاد وھو قولہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۳ مطبوعہ مصر۔

وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

[2] تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لئے (پردۂ عدم سے) باہر لائی گئی، جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔

الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج ۶) دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔

اصلاح وہدایت کی مشکلات

ہر قوم کی اصلاح وہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان ان کے سر سے گزر چکا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے، لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے، اس کو لڑ کر لے لو اور اسی پر تخت سلطنت جماؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جاکر لڑو، ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے یہ ایک امتداد معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعتوں سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر منقرض نہیں ہوگئی، بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی، اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت

عرب کی قوم امی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا، ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی، قرآن مجید نے ان کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے۔

یٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۭ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَاۗؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یٰس-۱)

قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے، راہ راست پر ہے یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے تاکہ تو اس قوم کو آگاہ کرے جس کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ښ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓي اٰلِهَتِكُمْ ښ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ښ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص-۱)

اور انہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا کافر لوگ نے کہا یہ دروغ گو جادوگر ہے، اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے پنچ اٹھ کھڑے ہوتے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، اس میں اس (پیغمبر) کی کوئی غرض ہے، ہم نے تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا، یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (ق-۱)

بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔

صفات الٰہی، آثار نبوت، احوال معاد، ان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سراپا حیرت بن جاتے تھے اور نبوت کے

متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں، اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیئے تھا۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰئِكَةُ (فرقان ۳۰)

اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔

إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللّٰهَ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلٰئِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ (فصلت ۲)

پیغمبر جب ان کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو وہ فرشتوں کو اتارتا، ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰى إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَسُولًا قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰئِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا (بنی اسرائیل ۱۰)

ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

نبی کا تخیل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماوراء صورت میں، یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو اس کے پیچھے خدا اور فرشتوں کا پرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں۔

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلٰلَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰئِكَةِ قَبِيلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَاءِ (بنی اسرائیل ۱۰)

انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے تو چشمہ نہ بہادے یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو جس میں نہریں جاری کر دی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہے ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہ گرا دے یا خدا اور فرشتوں کو پرا بنا کر نہ لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا أَوْ يُلْقٰى إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا (فرقان ۱)

انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے یہ تو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لئے خاص کوئی باغ کیوں نہ ہوا جس سے یہ کھاتا۔

پیغمبر کے لئے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو، اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائیداد ہو میوؤں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گزشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے اسی لئے مکہ اور طائف کے جو رؤسا دولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (زخرف ۳)

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً (فرقان ۳)

کافروں نے کہا اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اترا۔

وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ (بنی اسرائیل - ۱۰)

اور کافروں نے کہا، ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم پڑھنے لگیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ (انعام - ۱)

اور اگر کاغذوں میں لکھی ہوئی کوئی کتاب ہم آسمان سے تم پر اتارتے جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے، الوہیت اور صفات الٰہی کے اسرار، نبوت کے خصائص، نزول کتاب کی حقیقت، ہر چیز ان کے لئے حیرت و استعجاب کا سرمایہ تھی۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ (مومنون - ۴)

کیا انہوں نے بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، تو اس کے منکر ہیں۔

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہوگئے، لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے، ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سراپا لبیک تھے، حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا حنفاء کے آغوش پروردہ تھے، اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تمسخر سے دیتے تھے اور رموز نبوت کے دانا چشم پرنم اور دل پرکیف سے۔

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا (بنی اسرائیل - ۱۲)

جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے ایک پیغمبر آخر الزمان کے بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا، رو کر وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ

ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، اس سبب سے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترا ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں

الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (مائدہ - ۱۱)

اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے، ہم کو بھی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، وہ بھی چشم دل کو بینش حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بقرہ - ۱۷)

جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ۔ بقرہ - ۱۱

اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، مجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہ کا جویاں ہے، حضرت سعید بن زید، عثمان بن مظعون، صہیب رومی، ابوذر غفاری، سلمان فارسی وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں، اسی قسم کے لوگ تھے، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین و کفار خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے، لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ، مکہ کا قریشی عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک تریپن برس تک آپ کے چہرۂ پر نور کو دیکھتے رہے لیکن نور الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلام یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پُرانوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے، روسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزول وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے اور نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں، قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جو ان کی زبان سے آخری نبی کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اس دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں، طائف کے سنگدل جاہل، نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرۂ پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے راز نبوت کے نامحرم دعوت حق کا جواب اکیس برس تک تیغ و سنان سے دیتے ہیں، لیکن یثرب، ہجر، یمن، عمان اور بحرین کے بڑے بڑے اور عظیم الشان قبائل جو یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کسی قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آواز حق پہنچنے کے ساتھ دفعۃً مسلمان تھے۔

آبائی دین و رسوم کی پابندی

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے۔ انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں، دوست و آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی، آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و دولت سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع، وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے، ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے، عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ، عرب کی قوم، قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقاء و استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو ہم توراۃ میں پڑھتے ہیں، وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں، مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں، دین ابراہیم کے چند اصول حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے، ان کے شعر و شاعری اور فخر و مباہات کا سب سے پرجوش مضمون آباء و اجداد اور نام و نسب پر فخر و غرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی دین آبائی کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ

(البقرہ-۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو، کہتے ہیں نہیں، بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں (تب بھی)

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔

(زخرف-۲)

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر رستہ پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا لیکن اس کے دولتمندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم کے پیرو ہیں، کہو اے پیغمبر کیا اگرچہ میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم ان ہی کی پیروی کرو گے) انہوں نے کہا کہ ہم تو جو دے کر بھیجے گئے ہو، اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے کہہ دے اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اعراف-۳) | ہو جو تم نہیں جانتے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (مائدہ-۱۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے وہی ہم کو کافی ہے، کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر چلیں (تب بھی وہ انہی کی پیروی کریں گے)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (لقمان-۳)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم و ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، کیا اگرچہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے)

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کا چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا، آپ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر، بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں، مکہ میں جب آپ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے دعوت پر لبیک کہا، تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابو طالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کئے وہ یہ تھے اے ابو طالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے ہم کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے تو یا تو تم اس کو روکو یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا، ابو طالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا، تو کچھ دنوں کے بعد پھر انھوں نے اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا، اے ابو طالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا، اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی برائی اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ؛ اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابو طالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: اے ابو طالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوش رو جوان ہے تم اس کو متبنیٰ بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لئے ہمارے حوالہ کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے، تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے اور ان کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے، سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر گفتگو کی اور کہا، اے محمدؐ! تمہارے سوا کسی قوم میں ایسا آدمی نہیں آیا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو، جو تم لائے ہو تم نے باپ دادوں کو برا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی، ہم کو بیوقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا، غرض کوئی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔[1]

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو، معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا ان پر کتنا بار تھا، اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے، موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے

---

[1] یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں بتفصیل مذکور ہیں۔

پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا، لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے[۱]۔

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی اور وہ آپ کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوتِ حق کو اپنے دینِ آبائی کے مقابلہ میں پذیرائی کے قابل نہ سمجھے، بھتیجے نے بار بار کہا، چچا جان! کلمۂ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے، ابوطالب نے جواب دیا، جانِ پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔ عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی، آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ چچا جان! اب تو لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں، ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا، ابوطالب کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے آپ بار بار لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے، اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں اور لا الٰہ الا اللہ نہیں کہا، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے[۲]، صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو، میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا[۳]۔ ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ آہستہ وہ فقرہ کہہ دیا[۴]، بہرحال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس اسلام سے باز رکھنے کے لئے اس سے زیادہ پُرزور اور پُراثر دلیل نہ تھی کہ ابوطالب کیا آبائی مذہب کو چھوڑ دو گے؟ اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

توہم پرستی عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکلا تو فوراً بلائیں آکر ہم کو لپیٹ جائیں گے، عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور دسیوں صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام ان ہی اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے، مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گذاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا، فرزندِ نرینہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بنا پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا، اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا، حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا۔

إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ (ہود - ۵)

ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو ستایا ہے۔

ابتداً جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا[۵] جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے[۶]، ضمام بن ثعلبہ ایک صحابی تھے، وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات و عزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ضمام! ان کو برا نہ کہو، دیکھو کہیں تم

---

[۱] مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان [۲] کتاب الجنائز باب قال المشرک عند الموت لا الٰہ الا اللہ [۳] صحیح مسلم کتاب الایمان باب ۹ [۴] ابن ہشام وفات ابی طالب [۵] ابن کثیر، زمخشری، ابن حبان، البغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے، دیکھو تفسیر آیہ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وغیرہ فَمَا بِصَاحِبِهِمْ مِنْ جِنَّةٍ [۶] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ

کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔[1] حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں کفار نے کہنا شروع کیا کہ لات و عزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔[2] حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے کہا دیکھو ذوالشریٰ (بت) کہیں برباد نہ کر دے۔[3]

فتح مکہ کے بعد جب کہ دیوتاؤں کے زور و قوت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم لات، عزیٰ، مناۃ، ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے، خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے جنھوں نے اس فرض کو انجام دیا، پوجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے، جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ و برباد ہو جائے گا۔[4]

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری، مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے لیکن قوانین گاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے، جس طرح ایک غیر مسلمان عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو منافع تو قع بھی کر لیتے کہ اب وہ ہر قسم کے آفات ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں، اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعۃً وہ متزلزل ہو جاتے تھے، صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ہے۔[5]

کان الرجل یقدم المدینۃ فان ولدت امرأتہ غلاما ونتجت خیلہ قال ھذا دین صالح وان لم تلد امرأتہ ولم تنتج خیلہ قال ھذا دین سوء۔

باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا، اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کہتا کہ یہ نہایت بُرا مذہب ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے۔[6]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (حج - ۲)

اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچا تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے لیکن اگر مبتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً رو برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے اور اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔[7] سوء اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے، ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں جب حضرت ابوبکرؓ و حضرت بلالؓ آئے تو سخت بیمار ہو گئے۔[8] حضرت طفیل بن عمرو دوسی نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا موافق نہ ہوئی۔ اگرچہ مخلصین اور ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا، تاہم عام لوگ جن کی اوہام پرستی فطرت ثانیہ ہو گئی تھی، وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ

---

[1] مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ [2] اسد الغابہ ترجمہ حضرت زنیرہؓ و سیرۃ ابن ہشام ذکر مستضعفین مسلمین [3] اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمرو دوسی [4] ابن سعد و طبری ذکر اصنام [5] تفسیر سورۂ حج جلد ثانی ص ۶۹۲ [6] صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج [7] مستدرک حاکم ج ۳ و اصابہ ذکر عبداللہ بن زبیر [8] صحیح بخاری کتاب المرضیٰ و باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینہ [9] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

میں آکر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا، تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے[1]، اسی طرح ایک بدو نے آکر آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن سوء اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی، آپؐ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی۔ اور فرمایا[2]۔

المدینة کالکیر تنفی خبثها و تنصع طیبها۔ — مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے

ان ہی اسباب کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی۔

اللھم حبب الینا المدینة کحبنا مکة او اشد، اللھم و صححها و بارک لنا فی مدها و صاعها وانقل حماها فاجعلها بالجحفة۔[3] — خداوندا مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنا دے، اس کو امراض سے صحیح کر دے، اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔

قبائل کی خانہ جنگیاں

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا مٹنا قریباً محال تھا، ان ہی لڑائیوں نے ثار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لئے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا ہزاروں برس کے خون قومی فرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے، جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ثار کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے، اس لئے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا۔

اس بناء پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا، مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لئے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، بنی امیہ کی مخالفت اس کے لئے لامحالہ ہونی تھی۔

مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے، اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا، تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بھی بیسیوں منافق تھے، انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا[4]۔

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی، مدینہ آنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی، خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب المحاربین [2] بخاری ج ۲ ص ۲۵۳، کتاب الحج فضائل مدینہ و باب اعتصام السنة [3] صحیح بخاری مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینہ [4] ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔

خوب غور کرو، انصار اسلام لا کر ہمہ تن نیکوکاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے، لیکن تار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعۃً مشتعل ہو جاتے تھے ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا، تو انصار کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج کی تلواریں میان سے نکل آئیں[1] اور بڑی مشکل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہؓ کے واقعہ افک میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعدؓ بن معاذ نے کہا یا رسول اللہ! اگر وہ (تہمت لگانے والا) ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں اور اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجالاؤں گا، اس پر سعدؓ بن عبادہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے دفعۃً کھڑے ہو گئے اور کہا

كذبت لعمر الله لا تقتله ولا تقدر على قتله ولو كان من رهطك ما احببت ان يقتل۔

خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو اس کو قتل نہ کرے گا نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جاتے چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے۔

فثار الحيان الاوس والخزرج حتى ان يقتتلوا، ورسول الله قائم على المنبر۔

پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت و خون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور اقرع ابن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی، بات بڑھی اور سخت شور و شغب ہوا تو آپ نے عیینہ سے فرمایا "دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے"؟ اس نے کہا خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستالوں، جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے، اس پر اور شور و غل ہوا، آپ نے پھر یہی الفاظ فرمائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا، چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تھا، اس لئے قبیلہ بنو لیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا، کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکریوں کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو بدک کر بھاگ گیا، یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے اس لئے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سفر میں تھے اس لئے دیت میں ۵۰ اونٹ اسی وقت دیئے اور مدینہ پہنچ کر ۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔[2]

اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی اور تلواروں کے میان میں کر لینے کا حکم دے دیا، تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہا تھا، اس نے زمانہ جاہلیت میں

---

[1] اصابہ ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۸۸، معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے، بہم عبداللہ۔ [2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک۔ [3] ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۵۵ کتاب الدیات۔

قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا اور وہ لوگ انتقام کے لئے اس کو ڈھونڈ رہے تھے، سوءِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہِ نبوت میں پہنچ گیا، تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا، آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے، ان لوگوں نے حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ سے سفارش کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"خدا نے مکہ کو دار الحرام بنایا ہے، آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لئے اس کو میرے لئے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے زیادہ نافرمان بندے تین کوئی ہیں ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا، تیسرا وہ جس نے زمانہ جاہلیت کا انتقام لیا، تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔"

چنانچہ آپ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔[1]

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس و خزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنو ثعلبہ اسلام لا کر جب مدینہ آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوائیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا الا یجنی والد علی ولد[2] یعنی لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا، اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب و حریف مقابل تھے، دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا، انصاری نے یاللانصار (انصار کی دہائی) پکارا، مہاجر نے بھی یاللمہاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی۔ آپ نے نکل کر فرمایا کہ یہ کیا جاہلیت کی پکار ہے۔

مابال دعوی الجاھلیۃ۔[3] یہ کیا جاہلیت کا دعویٰ ہے۔

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعل شنیع کا سخت دشمن ہے، اس لئے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا، عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر ہو کر اس کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ثار وہ جانتے تھے کہ اسلام لا کر اس خاندانی فرض ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی، ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے۔

وکان لہ ثار فی الجاھلیۃ وکرہ ان یسلم حتی یاخذہ۔[4] ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں، انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔

اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا، بنو عقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں، چنانچہ انہوں نے اسی

---

[1] مسند امام احمد حنبل جلد ۴ ص ۳۲ [2] دار قطنی ج ۲ ص ۳۰۸ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۹ ذکر نہی دعوت جاہلیہ [4] اسد الغابہ ص ۸۵ ج ۴۔

وقت بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے، حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔[1]

سیاسی مشکلات

جہالت، وحشت، پابندی رسوم، آبائی اثر وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی، تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائل عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلہ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علمبردار تھا، بنو امیہ کے بعد اور دوسرے جو خاندان بھی تھے اور جو حرم کے مناصب دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد و اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے، ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا محمد کی دعوت اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے ؟ تو اس نے صاف کہا کہ میں کیا کہوں محمد کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں، اس کے جواب میں ہم نے اسی شان کی دعوتیں کھلائیں، انھوں نے خون بہا دیئے ہم نے بھی بہا دیئے، انھوں نے زرپاشیاں کیں، ہم نے بھی کیں، ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعۃً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آگئی، اب ہم کہاں تک برداشت کریں خدا کی قسم ہم کبھی محمد پر ایمان نہیں لا سکتے۔[2] یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھوں قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کاش مجھ کو کاشت کاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔[3]

خوب غور سے دیکھو، بدر، احد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کر رہا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثل غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہل مکہ کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف و ہم عہد تھے، خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے، لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر ان ہی یہودیوں کے زیر بار تھے انہی سے قرض دام لیتے تھے، انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے۔[4] خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے باہم حلیف تھے، اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلہ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ، تمام عرب میں قبلہ گاہ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لئے آتا تھا اور آستانۂ کعبہ پر سر جھکاتا تھا کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے بلکہ خیمہ و خرگاہ، تیغ و سپر، جاہ و حشم غرض ریاست و امارت کے تمام سر و سامان رکھتے تھے اس لئے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہوا، اسلام کو چین نصیب نہ ہو سکا، لیکن اسلام کی مخالفت صرف قریش کی متابعت تک محدود نہ تھی، بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہ راست وہی تمام رؤسائے قبائل کو پہنچتا تھا عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا اور مال غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے، اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آتی تھی، اس کو چھانٹ لیتا تھا، اس کا نام صفی تھا، یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوتی تھیں، یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی، باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے، یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالک [2] ابن ہشام حصہ اول ص ۱۰۸ مطبوعہ مصر طبع اول [3] صحیح بخاری واقعہ بدر [4] طبری واقعہ خیبر۔

قبائل میں یہی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا، اور اس لئے ایک کے بدلے میں دو قتل کرتے تھے یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوہ بدر میں قریش کی فوج میں سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بنا پر ان کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ انصار اور قریش کا جوڑ نہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندان غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا، ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آگئی، جبلہ نے اس کے گال پر تھپیڑ دے مارا، اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی، حضرت عمرؓ نے واقعہ سن کر کہا اس کا کیا قصور ہے، تم نے جو کیا، اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا، حضرت عمرؓ نے کہا ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا جو مذہب شرفاء کو ذلیل کر دیتا ہے میں اس سے باز آتا ہوں، یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔

عرب کا ہر رئیس قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا، اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا اس کے دربار میں شاہ و گدا، رئیس و عامی، شریف و حقیر کا ایک درجہ تھا، اس لئے عرب میں تمام روسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا، ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا تھا۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے، سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے، پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی دغا کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا، اس لئے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دین توحید کے مقابلہ میں انہوں نے اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب و غطفان کے معرکے پیش کئے۔

عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہی دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لئے اس ملک میں ایک اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہیں آسکتا تھا، اسی لئے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی دار و گیر کرنی چاہی، کسریٰ ایران نے یمن کے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعہ معاش

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہزنی تھا، ابوبکر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا اور حج کے چار مہینوں میں جنگ و غارت

سے باز رہنے میں ان کے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے، اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے اندرونی عرب تمام دشت وصحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں، باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لئے ان کو غارت گری کرنی پڑتی اور امتداد زمانہ سے یہ عادت ان میں رائج ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعراء چور اور راہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اسی لئے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا، دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے، تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظ ماتقدم کے لئے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا۔

اما الاسلام فاقبل و اما المال فلست منه فی شیٔ (صحیح بخاری کتاب الشروط ذکر صلح حدیبیہ)

اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے، حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ چوری نہ کریں گے، اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا ورنہ آج اگر شرفاء سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا، اس لئے عربوں کو اسلام قبول کرنے کے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں یعنی وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے، کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے، تو اب ان کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے، وہ شہری متمدن زندگی بسر کرتے تھے، تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعہ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر رکھے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف مقابل تھے، اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعتہً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (۲۸ جلد ۴) میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے ہیں۔

قال الشافعی کانت قریش تنتاب الشام انتیابا کثیرا و کان کثیر من معائشها منه و تاتی العراق فیقال لما دخلت فی الاسلام ذکرت للنبی صلعم خوفها من انقطاع معائشها بالتجارة من الشام و العراق اذا فارقت الکفر

امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد ورفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اسی غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے، تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرتؐ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا

ودخلت فی الاسلام وخلاف ملک الشام والعراق لاھل الاسلام فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا ھلک کسریٰ بعدہ فلم یبق بارض العراق کسریٰ یثبت لہ امر بعدہ وقال اذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ فلم یکن بارض الشام قیصر فاجابھم علیٰ ما قالوا۔

جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی، اس پر آپ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا، چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور آپ نے فرمایا کہ جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا، چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہیں ہوا جس کی وہاں حکومت ہو، اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔

رفع شک اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوتی ہے، اہل مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورا کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے، اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے، اسلام نے چار بیویاں اور لامحدود لونڈیوں کی اجازت دے دی، اہل عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے، جہاد اور تعداد ازدواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعداد ازدواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا، لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے، جہاد کے لئے اور بہت سی پابندیاں تھیں جو پہلے بالکل نہ تھیں، جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے، دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے، جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھیں ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے، لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، پہلے نکاح کے لئے تعداد کی کوئی قید نہ تھی، ایک ساتھ آٹھ آٹھ دس دس شادیاں کرتے تھے، اب چار کی قید ہوگئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے، اس لئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا، تمام تر غلط ہے، برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایات قدیمہ جہالت، عادات رسوم، نفس پرستی، ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہوتی ہے وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں، آج یورپ علوم و فنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے لیکن بیہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں، اب بھی قائم ہیں، یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں اور جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں اسلام ایک ایک کا دشمن تھا، ثار یعنی انتقام خون، عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا، خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی

کی روح تھی جو فنا کر دی گئی، ابو سفیان رئیس العرب کو بلالؓ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید و سالم وغیرہ) کے گھروں میں آگئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے سب سرد پڑ گئے۔

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس، اور تفریح طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی، جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ (بقرہ-۵) اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے۔

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا سخت ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا نہ کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہو گئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا، لیکن اب حج وہ جاہلیت کا حج نہیں رہا تھا، طواف عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی، بڑی دلچسپی کی چیز بُت تھے، وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیئے گئے، مقام منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا، بند کر دیا گیا، یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا، اسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالمگیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی، زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس و حریر حرام، چنگ و عود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی اور لطف زندگی کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو، تمام دیگر مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے، پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفریب بُت ہوتے ہیں لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔

پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

*

تبلیغ نبوی

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گزشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا، اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے، لیکن کارلائل[1] کے بقول نہتے اور یکہ و تنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی، اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضۂ تبلیغ

"تبلیغ" کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں، قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ "انذار" ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں دوسرا لفظ دعوۃ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تذکیر ہے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں، بعثت نبوی کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بدھ مت، باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے جو تبلیغی نہیں، جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندویت، جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے، ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیرووں کا عمل ہے؟ کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعمیم دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیئے اور اس کے داعی وحامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے، کوشش سے نہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس و کمتر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی ۱۵) یا یونانی (مرقس ۷) عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا، میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (متی ۱۵-۲۵) پھر فرمایا، مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں، (۲۶) پھر فرمایا، غیر قوموں کی طرف نہ جانا، اور سامریوں کے

[1] ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (محمد)

کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو (متی ۱۰-۶) پھر ارشاد فرمایا، "وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو" (متی ۷-۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے، یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اس لئے اپنی تبلیغ کے لئے قریش وغیر قریش، حجازی و یمنی، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی، بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا، ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ (مدثر) اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہشیار و آگاہ کر، پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا) فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ (شوریٰ) لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا۔ فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی (اعلیٰ) لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو۔ وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ (ذاریات-۳) اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ (ق-۳) قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔ اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علیؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق کو قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے۔[1]

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا، ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچایئے، اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہیں دیا۔

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ؕ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ؕ (مائدہ-۱۰)

اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے، اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچائے گا۔

اس کی وسعت

اس کے بعد اس فریضہ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغام الٰہی سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو، پھر آگے کو، پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا، سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء-۱۱) — اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ و ہشیار کر۔

---

[1] صحیح مسلم باب خیبر۔

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا۔ (شوریٰ ۔ ۱)

تاکہ تو مکہ اور جوار کے آس پاس کے بدوی) ہیں ان کو آگاہ و ہوشیار کرے۔

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ، احساس وعقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ، لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (یٰس ۔ ۵)

یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تاکہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔

پھر جس حد تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے۔

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔ (انعام ۔ ۲)

تاکہ میں تمہیں آگاہ و ہشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ و ہشیار کرنے والی آواز پہنچے۔

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہوتی ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (ابراہیم ۔ ۷)

یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ (سبا ۔ ۳)

اور ہم نے تم کو انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا۔

آپ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں،

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (اعراف ۔ ۲۰)

اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت و تبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے، فرمایا۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا، الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (فرقان ۔ ۱)

برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمدؐ) پر نازل کی تاکہ وہ دنیا جہان کے لئے ہشیار و آگاہ کرنے والا ہو، وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس کی کامیابی کی خوشخبری عین اس وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ، وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ۔ (ص ۔ ۵)

یہ قرآن تو دنیا کے لئے نصیحت ہے، اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔

انبیاء: دربانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں، وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو بھی نجات کا راستہ نہیں بتایا

اور نہ اس کا حکم دیا، حضرت عیسیٰؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا، نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلّغ بھیجا حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہوشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاشِ حق کے لئے آپ کے پاس آئے، مدینہ منورہ آئے تو قریش گو بر سر جنگ، دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدِ راہ بنے رہے، پھر بھی مبلّغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی گئی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لئے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پُر امن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو فتحِ مبین قرار دیا اور اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا نازل ہوئی، اس کے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے واعظ، قاصد اور مبلّغ بھیجے گئے اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، حبش اور روم کے طالبین اسلام لائے اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے، مشرکین عرب، یہود، عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

لیکن نفسِ تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا، وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لئے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفۂ محمدیؐ نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (نحل-۱۶) — اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق سے کر۔

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے، عقل و حکمت، موعظۂ حسنہ اور مناظرہ بطریقِ احسن۔ مسلمان متکلمین نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات جن میں مؤثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے جدلیات جن میں مقبولِ عام اقوال اور فریقین کے مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے، قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت، دوسرے کو موعظتِ حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی بات پیش کر کے اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں، یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دل نشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور مؤثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں

---

[1] صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ۔

کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت دوسرے کا نام موعظہ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے، تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

قول لین حکیمانہ استدلال ہو، یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ یہ ارشاد بھی ہوتا ہے۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ-۲)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا (خدا سے) ڈرے۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے، پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعیوں، مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں، مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اعراض اور قول بلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوتے تھے، یہ حکم ہوتا ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (نساء-۹)

تو ان سے درگزر کر، اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو اُن کے دلوں میں اثر کرے۔

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں، اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بد سلیقگی، بد تہذیبی اور درشتی سے درگزر اور ان کو برداشت کرنا چاہیے، دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر ان ہی ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا[1] دین الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا، یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دین الٰہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی، دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے

[1] صحیح بخاری بعث معاذ الی الیمن جلد دوم صفحہ ۶۲۲۔

دلوں کو پُرامید اور مسرور بنانا، اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت وجلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کئے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیئے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم، پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے پھر زکوٰۃ ہے، پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے فرمایا تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے، تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کا رسول ہے، جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے، یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دے دیا جائے، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بڑھیا مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا، کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔[1]

تالیف قلب تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جس کو تالیف قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (توبہ۔ ۸) اس کے لفظی معنی ہیں "دلوں کو ملانا" اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو، لطف و محبت، امداد و اعانت اور غمخواری و ہمدردی کرنا ہے، کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے اور یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبول حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی میں تقسیم کر دیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں، صفوانؓ جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت بغض رکھتے تھے، وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، اتنا دیا، اور مجھے ان سے سخت بغض تھا، لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں[2] ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھ کو عنایت کیجئے، آپؐ نے اس کو وہ سب دے دیئے، یہ فیاضی دیکھ کر ایسا اس پر اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ سے جا کر کہا، بھائیو! اسلام قبول کرو، محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا۔[3]

ایک یہودی کا لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے، پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے، اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچا لیا۔[4]

دعوت عقل اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کر بغیر اس کے حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور جدل و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بناء پر

[1] صحیح بخاری باب مذکور جلد دوم ص ۱۰۶۳ [2] صحیح مسلم باب جود ہ صفحہ ۲۲ ج ۲ ص ۲۹۰ مصر [3] ایضاً [4] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمدیہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا حرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا۔ اس نے اپنی ہر تعلیم کے ساتھ اپنی تعلیم کی خوبی و مصلحت و حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیات الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت کی، فرمایا۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (انعام - ۱۸)

کہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لئے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو، کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل۔

نیز ارشاد ہوا۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (انفال - ۵)

تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جیے اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف - ۱۲)

اور آسمانوں میں اور زمین میں (خدا کی توحید کی) کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔

غور و فکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران - ۲۰)

بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار تو نے (یہ عالم) بیکار نہیں بنایا۔

اس سے زیادہ عقلی یا علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا، اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی، فرمایا۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذریات)

اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔

صحیفۂ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے۔

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (ق - ۱)

یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لئے

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (اعراف - ۲۴)

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (جاثیہ - ۲)

یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (نساء - ۱۱)

کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد - ۳)

کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے ہیں۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یس - ۱)

حکمت والے قرآن کی قسم۔

تِلْكَ آيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (یونس و لقمان-۱) یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا و سزا، عبادت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں، آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتلاتے ہوں، جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، وہ ہر قدم پر عقلی استعداد اور مصلحت و حکمت کا اظہار کرتا ہو وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں، اسلام میں مذہب کا اولین جزو ایمان ہے، ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی فرمایا

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (بقرہ-۳۴) دین میں کوئی زبردستی نہیں ہدایت، گمراہی سے الگ ہو چکی۔

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوتی، دوسری جگہ فرمایا،

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف-۴) اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور جو نہیں وہ اس سے محروم رہیں گے اس لئے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی منوانا نہیں ہے

اِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (مائدہ-۱۲) ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے صد درجہ غمگین تھے تسکین دی گئی۔

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ-۵) اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (غاشیہ-۱) اے پیغمبر! تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ-۵) پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے پیغمبر ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے، فرمایا،

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے، تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے تو کیا اے پیغمبر تو لوگوں سے زبردستی

يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (یونس۔۱۰) کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے لڑنا جائز ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا۔ اسی سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی صرف اس لئے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ (توبہ۔۱) اور اگر (لڑائی میں) کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو، کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے، اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، اور اس کو کلام الٰہی سنایا جائے تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا، اس کے تبدیل مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیام حق) ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت، مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا، قرآن کی اس آیت میں،

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (انفال۔۵) اور ان کافروں سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے، اور دین پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔

"فتنہ" سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمرؓ صحابہ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے، ایک شخص نے ان سے آکر کہا کہ خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لئے لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اوپر کی آیت پیش کی، انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کر چکے، جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا، اس کو لوگ یا مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔[1]

میدان جنگ میں تبلیغ ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی بھی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں، اول یہ کہ تم کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے، اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو، اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے، اور خونریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سرتاپا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے، اس کو مخالفوں نے اس

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم تفسیر انفال ص ۶۰۰۔

صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے۔

"جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رُک جا، اس کو اسلام کی دعوت دے، اگر وہ قبول کر لے تو پھر اس سے رُک جا، اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جاوے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے، اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی، قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فے میں اس کا حصہ نہ ہوگا، جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے[1]۔"

یہ وہ اصول جنگ تھے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی، نہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزور شمشیر مسلمان بنالینا، صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں، اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو، لیکن محکوم ہو کر رہو گے[2]، اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہؓ بن اثال قبیلہ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے، یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا، ثمامہؓ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھمبے میں باندھ دیئے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے جواب دیا محمدؐ! میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا، اور اگر زر فدیہ ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا، پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا، پھر تیسرے دن ہوا، تیسرے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو، لوگوں نے کھول دیا، وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو چکے تھے، مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی، مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے، کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کا اس سے بہتر موقع مل سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام، اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا، قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَاءً محمد، لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں، بالآخر شیر خدا علی مرتضیٰؓ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جائیں، وہ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا آہستگی سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ، پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ، اور اس میں ان کا جو حق ہوگا، وہ ان کو بتاؤ، خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔ [2] جامع ترمذی ابواب السیر۔ [3] صحیح بخاری و سنن ترمذی ربط الاسیر۔

تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں[1]۔ لیکن خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کی حکومت قبول کر لی، اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں، بلکہ کفر کا موجب ہے۔ کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا، اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا اور اپنی جان بچانے کے لئے کلمہ توحید پڑھ دیتا تھا تو ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے، میں مسلمان ہوتا ہوں، تو اے خدا کے رسول میں کیا کروں، اس کو قتل کر دوں؟ فرمایا نہیں، اس کا قتل جائز نہیں عرض کی یا رسول اللہ! میرا ہاتھ اس نے کاٹ دیا، پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا، جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ، اس اقرار توحید سے پہلے تھا[2]۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ آپؐ کے بڑے چہیتے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا، انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الہ الا اللہ پکار اٹھا، ایک انصاریؓ جو پہلے اس پر جھپٹے تھے، وہ تو رک گئے مگر اسامہؓ نے اس کافر کے، اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوتی تو اسامہؓ سے سخت آزردہ ہوتے، اسامہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا، "اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟" پھر برابر یہ فرماتے رہے اے اسامہ تم قیامت میں اس کے لا الہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے، اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت تھی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا[3]۔

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے، واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آوری اور لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے، جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لئے فوراً کلمہ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا، کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے آپؐ نے فرمایا امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں اور جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا اور ان کی نیت کی پرستش خدا کا کام ہے" اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الہ الا اللہ کہے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا، انسان کا فرض نہیں، خدا کا ہے، یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لئے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو، ورنہ سر قلم کر دیں گے، غور کرو، اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار توحید کئے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے، اور ہاری ہوئی

[1] صحیح بخاری غزوہ خیبر [2] صحیح مسلم کتاب الایمان [3] صحیح مسلم کتاب الایمان ص ۵۲ ج ۱، مصر

قوموں سے اسلام نہیں، صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا ہے، اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال - ۸) | اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لئے جھکے تو تو بھی جھک جا۔

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (توبہ - ۱) | اور اگر (لڑائی کے میدان میں) مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لئے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو، مگر ایسا نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ پلٹ کر بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں، لڑنے کو منع کیا ہے۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (نساء - ۱۲) | تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں، پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ "یا تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی، اس صلح جوئی اور اس ترکِ جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی۔

مسلح تبلیغی جماعتیں

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں، لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منتظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی، جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسر پیکار تھا، راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا، جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا، اسی لئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لئے مسلح جاتی تھیں، اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا، اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لئے ادھر ادھر بھیجا تب بھی وہ اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں، واقعہ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریہ ابن ابی العوجا میں پچاس مسلمانوں کی شہادت، واقعہ ذات اطلاح میں پندرہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھد جانا، اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ و دعوت کی تنظیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے، بنفس نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے، ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس جلسوں اور

آنے جانے والوں کو بشارت سناتے، مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا، جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے خود یہاں آتے تھے، آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے، مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر کی مصلحت بھی عجیب و غریب تھی ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گذرے اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوئی۔

مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابوبکرؓ تھے، مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان ان ہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعبؓ بن عمیر ہیں، جن کے مؤثر وعظوں کو سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ آکر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لئے جو اطراف ملک سے دارالاسلام میں آتے تھے، نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحاب صفہ (چبوترے والے) مشہور ہے، اس میں بعض اوقات سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے، بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے تھے، وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ اکابر صحابہ بھی وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پہنچے احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں، میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس ۳۵ صحابیوں کے نام جمع کئے ہیں جنھوں نے از خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا، ان کے نام یہ ہیں، ابوذر غفاریؓ، طفیل بن عمرو دوسیؓ، جعفر بن طیارؓ، عمرو بن عنبسہؓ سلمی، ضماد بن ثعلبہؓ، خالد بن ولیدؓ، علیؓ بن ابی طالب، مہاجر بن ابی امیہؓ، زیاد بن لبیدؓ، خالد بن سعیدؓ، عدی بن حاتمؓ، علاءؓ بن حضرمی، ابو موسیٰ اشعریؓ، معاذ جبلؓ، جریر بن عبد اللہ بجلیؓ، دحیہؓ کلبی، عمرو بن امیہؓ ضمری، مغیرہؓ بن شعبہ، عمروؓ بن العاص، وبرؓ بن یحنس، عروہؓ بن مسعود ثقفی، عامرؓ بن شہر، منقذؓ بن حبانؓ، ثمامہؓ بن اثال، معیقبؓ بن مسعود، احنفؓ، ابو زید انصاریؓ، عمرؓ بن مرہ، عیاش بنؓ ربیع مخزومی، واثلہؓ بن اسقع، عبد اللہؓ بن حذافہ سہمی، حاطبؓ بن ابی بلتعہ، سلیطؓ بن عمرو بن عبد شمس، شجاعؓ بن وہب اسدی، ان ہی مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی، جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد، غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت

سیرت کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعت اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے، سلسلہ بیان کے لئے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے

قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں، لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا، وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی، اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا اس کی تبلیغ کے لئے جہاں کی ضرورت تھی، مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں، بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا، فرمایا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان۔۵) — تو اے پیغمبر منکروں کا کہا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور سے جہاد کر۔

اس پیغام الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے، فرمایا۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (ق۔۳) — تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہیں قرآن کے ذریعے یاد دلا۔

قرآن رحمت عالم کا پیام عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے، فرمایا۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان۔۱) — برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندوں پر اس لئے اتاری کہ وہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کرے۔

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب عرب میں صرف تین قومیں تھیں، جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ، مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے اسی بنا پر از روئے قرب فاصلہ و قرب کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار کو پہلے دعوت توحید دی جاتی، پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا، اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے، اسی لئے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذاب الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن مجید کا طرز خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات، ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں، سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی، اور فتح مکہ کے بعد قبائل عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا، اسی زمانہ میں سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں وہ خال خال پائے جاتے تھے، وہ بھی ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے، اس سے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان سے خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جا بجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے

اور ان کے عقائد کی تردید کی اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کیلئے کیا چیز درکار تھی

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا، لیکن ابتدا میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام قبول کیا، ان کے اوصاف پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل کا جویاں تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا، تو اس کے سامنے یہ طائر قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا، چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا، وہ وہی تھے جو نیک طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے، گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے، اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھیں، جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں، عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں، ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت، روایات اور رسم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں، لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج یمن، عمان، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی، انصار مدینہ نے خود مکہ میں آکر اسلام کو لبیک کہا، اطراف مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آکر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہوکر لا الہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلے کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لئے پیش کیا، اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف باسلام ہوا، ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہوگیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا، وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا، ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک آدمی بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زدوکوب کیا، اس نے آکر آپ سے یہ واقعہ بیان کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اگر اہل عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے (مسلم فضائل اہل عمان)

یمامہ کے رئیس ثمامہؓ قید ہوکر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیئے گئے، مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا، اس نے ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہوگئے اور اپنے قبیلہ میں جاکر اسلام کے داعی بن گئے، اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کرلی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافات بحرین میں تھا، اسی قریہ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا، بارگاہ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے، لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔

اہل یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت

---

۱ مستدرک حاکم ج ۲ ص ۱۹۵ مع علی شرط مسلم ۲ صحیح بخاری باب الجمعۃ فی القریٰ والمدن۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے، بحری سفر تھا وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو باد مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرت تھا، وہاں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہیئے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانہ میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے[1]۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ ۭ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (توبہ-۱۲)

دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارے ہیں، اور اللہ جاننا اور حکمت والا ہے۔

اور بھی اسی قسم کی آیتیں ہیں، جو لوگ بادیہ سے آکر اسلام لاتے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی، اس کا نام بیعت اعرابی تھا، جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی، اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا، بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے[2]۔

اشاعت اسلام کے اسباب و ذرائع

گزشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو کیونکر کامیابی ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبول اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے، تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے۔

(۱) اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا، قرآن مجید جس موثر اور دل ہلا دینے والے طریقہ سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا، اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع کا ذکر اوپر ہو چکا، فنا ہو جاتے تھے جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے، قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہر قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا۔

کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (بقرہ-۳)

تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو، حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی پھر ایک دن تم کو مردہ بنا دے گا، پھر زندہ کرے گا اور پھر اسی کے پاس واپس کئے جاؤ گے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ

آسمان اور زمین کی پیدائش میں، شب و روز کے اختلاف میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لئے سود مند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برسانے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں ہواؤں کو چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں

---

[1] صحیح مسلم فضائل جعفرؓ بن ابی طالب واسماءؓ بنت عمیس۔ [2] صحیح مسلم کتاب الامارۃ اور سنن نسائی کتاب البیعۃ۔

وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (بقرہ - ۲۰)

دانشمندوں کے لئے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔

وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران - ۹)

آسمان و زمین میں جو بھی ہے برضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گزار ہے اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران - ۲۰)

آسمان و زمین کی خلقت اور شب و روز کے الٹ پھیر میں ان ارباب عقل کے لئے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (یونس - ۳۰)

وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں کے لئے جاری ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ دفعۃً زور کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آگئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ خدا کو مخلص ہو کر پکارنے لگتے ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس بات میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے، اس بات میں جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا، خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سے سننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

خدا یا ایک قوت اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے لیکن غفلت شعاری، اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے، قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے۔

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم)

کیا خدا میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (بقرہ - ۳)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی دی، پھر وہ تم کو موت دے گا، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

عرب میں ملحد کم تھے، زیادہ تر بلکہ تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظام عالم ان ہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہ راست اس کو کام پڑتا

ہے اس کو زیادہ مانتا ہے اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی، سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لئے انسان کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا ان ہی معبودوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، ان ہی سے محبت رکھتے تھے، ان ہی پر نذر چڑھاتے تھے، ان ہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے، معرکوں میں انہی کے نام کی جے پکارتے تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصل وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت موثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا تھا۔

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ ءَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ، أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ءَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ أَمَّنْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ءَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ.

کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور اس کے لئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتے ہیں، اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو، کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہوائیں کو بھیجتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، مشرکین جس کو خدا کا شریک کہتے ہیں، خدا ان سے برتر ہے، آیا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو لوٹاتا ہے، اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان وزمین سے روزی دیتا ہے، کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔

کفار و مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ۔ یعنی جب ہڈیاں گل سڑ چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا، قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا۔

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنَى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى، فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَى (قیامۃ-۲)

کیا انسان پہلے منی نہیں تھا، پھر گوشت کا لوتھڑا بنا، پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کردے۔

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال، ہر چیز کو قرآن اس موثر اور دل نشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا، اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے، وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا، حقیقی جحود اور انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے رؤسائے قبائل، بڑے بڑے شعراء، اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان لائے، حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ، ہم تمہارے لئے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، آپ نے حٰمٓ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں جب یہ آیت آئی،

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ (حٰم۔ فصلت۔ ۲)

تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔

تو عتبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھدیا اور کہا خدا کے لئے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جا کر قریش سے کہا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ تو شعر ہے، نہ جادو ہے اور نہ کہانت ہے،[1] بلکہ کوئی اور چیز ہے، حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحقیق حال کے لئے بھیجا تھا، وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں، لیکن میں کاہنوں اور شاعروں دونوں کے کلام سے واقف ہوں، ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔[2]

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (نحل۔ ۱۳)

خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش سے، بری بات سے اور ظلم کرنے سے منع کرتا ہے وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ نے دوبارہ پڑھا، واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔[3]

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقین اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ میں اپنے پاس بٹھا لیا، پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے، یہ کہہ کر آپؐ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں، عثمانؓ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔[4]

جبیر بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سورہ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَىْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (طور۔ ۳)

کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود خالق ہیں، کیا آسمان اور زمین کو ان ہی لوگوں نے پیدا کیا بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ان میں ایمان نہیں کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں، کیا یہی لوگ سربراہ کار ہیں۔

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد ۴ ص ۴۴ میں مسند ابو یعلی وغیرہ سے روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔
[2] صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ۔ [3] الجواب الصحیح جلد ۴ ص ۔ بحوالہ عبدالرزاق [4] مسند ابن حنبل جلد اول ص ۳۱۸ و ادب المفرد امام بخاری باب البغی۔

تو خود جبیرؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔[1]

طفیل بن عمرو الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے، لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں، لیکن جب عرم ہی اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔[2]

ہجرت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے اس کا جواب ڈھیلا اور پتھر تھا، تاہم خالد العدوانیؓ نے جو طائف کے رہنے والے تھے، آپ کو،

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ (طارق) قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارے کی۔

پڑھتے سنا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی اور آخر اسلام لائے۔[3]

حضرت ابو بکرؓ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا، اسی زمانہ میں انہوں نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن نماز بلند آواز سے پڑھتے تھے جس کو سن کر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچتا، چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابو بکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوتی جاتی ہیں۔[4] انصار اول جب مقام عقبہ میں اسلام لاتے تو قرآن ہی سن کر اسلام لائے تھے، جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلہ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔[5]

حبش میں جب آپ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہبا عیسائی تھے، تحقیق حال کے لئے مکہ میں آئے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابو جہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو، اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا، انہوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے، "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلَنَا دِينُنَا"۔

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی، جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، صدہا کافر مسلمان ہو گئے۔[6]

ایک ضروری نکتہ

عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لئے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں ہے اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورہ طور۔ [2] ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاد) نے بتفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے۔ [3] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵۔ [4] بخاری شریف ذکر ہجرت۔ [5] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۰۲۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۳ مطبوعہ مصر ذکر ہجرت حبش۔ [6] جامع ترمذی تفسیر سورہ روم۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا ہے جیسا اب ہے، لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا، قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا، دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے، وہ خدا کی عظمت و جلالت، اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزا، بعث و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاق حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دلوں میں گھر کرتے جاتے تھے اور ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لئے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام اور اعتقادات باطلہ تھے، جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں، مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے، یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعۃً فنا نہ ہو جاتے، یہ ارباب اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ہر معزز رئیس اپنے پورے قبیلے کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوت اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے بار بار دار النبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے، جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی، اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان ریاست و خود سری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لئے اگر کوئی خود غرضی بھی کرنا چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا، مؤلفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا۔

اب صرف معاشی ضرورت سد راہ ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذریعہ معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے، مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا، محمد رسول اللہ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی، ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعی نبوت بظاہر جامہ بشریت میں ہے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق، اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت اپنے ربانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ قرآن مجید نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق نبوت پر اسی مقدس اور معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس-۲)

اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت تک زندگی بسر کی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔

زندگی کا یہی اعجاز تھا، جس سے ظہور نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا، بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں ہو سکتا، نبوت محمدی کا معتقد اولین دنیا میں کون تھا ام المومنین خدیجہؓ بنت خویلد لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا، چالیس برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ، وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں "محمدؐ! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو، محتاجوں کی خبر لیتے ہو، مہمانوں کے ساتھ مدارات پیش آتے ہو، جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو[1]۔"

سن چکے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا ہوا تو ابوذر غفاریؓ نے انیسؓ اپنے بھائی کو تحقیق حال کے لئے بھیجا انہوں نے واپس آ کر پیکر نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا "میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے[2]۔"

نبوت کے بعد قریش نے ذات نبویؐ کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا، تاہم کوئی اخلاقی جرم بھی آپ کی طرف منسوب نہ کر سکے، اسلام کے سب سے اول اعلان دعوت کے موقع پر جب آپ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو خطاب کیا اور پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے، تو کیا یہ مانو گے؟ سب نے بیک آواز کہا "محمدؐ! تیری بات آج تک ہم نے جھوٹ نہ پائی[3]" ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۶ھ میں ہرقل قیصر روم کے دربار میں کفار قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہؐ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق اپنی شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف پیش نہ کر سکے، انہوں نے شہادت دی کہ محمدؐ کبھی جھوٹ نہیں بولے انہوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت، صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں، ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں، یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا یقین کیا[4]۔

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محاسن اخلاق، یعنی رفق، ملاطفت، حسن معاملت، جود و سخا، عدم تشدد، عفو، درگزر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لئے عطا ہوا تھا، قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے۔

وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران-۷)

اور محمدؐ! اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی [2] صحیح بخاری جلد اول ص ۴۹۹ قصہ اسلام ابی ذرؓ [3] صحیح بخاری تفسیر سورۃ تبت و صحیح مسلم کتاب الایمان باب وَانْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ [4] صحیح بخاری بدء الوحی۔

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی، اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپ نے دے دیں، اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے کہا "لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا"۔[1]

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تین سو اونٹ دے دیئے، خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس قدر دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے۔[2] ہندہ خاندانِ نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگِ احد میں قوتِ بازوئے اسلام حضرت حمزہؓ کے شکم کو اسی نے چاک کیا تھا اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا، اور اسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا وہ فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئی، اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی، لیکن دربارِ رسالت میں پہنچ کر آپ کے حسنِ خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی یا رسول اللہ! سطحِ زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے آپ نے یہ سن کر فرمایا خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا۔[3]

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا اس نے تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، اس نے کہا کہ میں تو لے ہی کے ٹلوں گا، آپ نے کہا کہ اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں، چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے، صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضی ظاہر کی اور خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے، آپ نے فرمایا ہاں، لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں۔ دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے، میں نے یہ گستاخی اس لئے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔[4]

ثمامہ بن اثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا، صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا تھا حسنِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا، گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی، آپ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ اس نے کہا کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا، اگر مال کی خواہش ہے، تو فرمایئے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا، یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے، دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا، تیسرے دن پھر یہی گفتگو ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اس کے بندگرہ کھول دیئے اور رہا کر دیا، اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا، غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہوا، محمد! زمین پر آپ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی، لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی، لیکن وہ آج میرے لئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰ باب ماسئل رسول اللہ شیئا قط فقال لا۔ [2] صحیح مسلم باب مذکور [3] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخی [4] مسلم جلد ۲ ص ۵۵ باب قضیۃ ہند [4] مشکوٰۃ ص ۵۲۱ کتاب الفتن فی اخلاقہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوشنما نظر آتا ہے۔[1]

ایک بار آپ کسی سفر میں تھے اور پانی ساتھ نہ تھا، صحابہؓ نے پیاس کی شکایت کی، آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھری ہوئی لے جا رہی تھی دونوں صاحب اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، آپ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیئے، صحابہ نے بار بار اس سے پانی پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کے محنت کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کا آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کرکے ایک کپڑے میں بندھوا کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا، وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا، اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بے دین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا، بلکہ تربیت یافتگانِ نبوت کے فیض اثر سے اس کے تمام قبیلہ تک وسیع ہو گیا۔[2]

نبی کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اس کا اخلاق ہی نہیں اس کی زبان کا ایک ایک حرف اس کی معصوم شکل و صورت اور اس کی ایک ایک ادا اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے۔

روے و آوازِ پیمبر معجزہ است (رومی)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے ہو جاتا تھا۔

جب آپ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا، حضرت عبد اللہ بن سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبر ان کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ فرما رہے تھے افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام۔[3] وہ واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں جوں ہی پہنچے، حضرت عبد اللہؓ بن سلام بھی آئے اور کہا کہ میں آپؐ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔[4]

ضماد ایک شخص تھے، جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہو گئے ہیں، وہ آپ کے پاس آئے اور کہا، محمدؐ! میں جنون کا علاج کرتا ہوں، اس کے جواب میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا۔

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ

تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں میں اس کی حمد کرتا ہوں اور اس سے مدد چاہتا ہوں، خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۶، کتاب الجہاد والسیر [2] بخاری ج ۱ ص ۵۰ کتاب التیمم [3] ابن حنبل ج ۵ ص ۴۵ [4] بخاری ج ۱ ص ۵۵۶ باب ہجرۃ النبی صلعم واصحابہ الی المدینہ۔

لاشریک لہٗ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ — سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے، آپ نے تین بار ان کلمات کا اعادہ فرمایا، انہوں نے کہا میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے لیکن آپ کے اس کلام کی طرح موثر کلام کبھی نہیں سنا، وہ سمندر تک پہنچ جائے گا، ہاتھ لائیے، میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں[1]۔

حضرت حلیمہؓ کے شوہر حارث یعنی آپ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مرکر پھر زندہ ہوں گے، انہوں نے آپ سے کہا، بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا، ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتادوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا، ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہوگئے، اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا[2]۔

انسان کا ۔ حقیقت کا آئینہ ہے، آپؐ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپؐ کی شکل نہایت پرجلال تھی، چہرہ پرنور تھا، او ۔ وقار اور پر رعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا، حضرت عبداللہؓ بن سلام نو مسلم یہودی عالم آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر اسی اثر سے متاثر ہوئے اور بے اختیار بول اٹھے تھے

وجھہ لیس بوجہ کذاب (ترمذی ص ۴۰۹) — جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہوسکتا۔

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوا تھا۔

ھذا وجہ مبارک (ابوداؤد حج جلد ۱ ص ۲۴۰) — یہ مبارک چہرہ ہے۔

بارگاہ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا، ابورافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ کی خدمت میں آئے تھے، جونہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ ہزار جان فدا تھے، اسلام قبول کیا اور آپ کی غلامی کو فخر سمجھا[3]۔

---

[1] مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ [2] اصابہ جلد ۱ ص ۲۹۶ تذکرہ حارث [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب یستجن بالامام فی العھود و اصابہ و استیعاب۔

اسلام

یا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے لیکن جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُر اثر دعوت، اعجاز معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق و موانع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی، اخلاق، ایثار، تمدن، تقویٰ، ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہوگیا اور گویا یہی حقیقت تھی، جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:

الا ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض (بخاری) — ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آگیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پُر درد وداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے:

قد ترکتم علی البیضاء لیلھا کنھارھا[1] — میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔

اور آخری حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ) — آج میں نے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کردی۔

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائید شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں،

"محمد کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک مشترک

[1] سنن ابن ماجہ ابواب سنت و بدعت و مستدرک حاکم جلد اول ص ۹۶ و مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۱۲۶۔

مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔[1]

ایک دور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس کا علم عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داؤد مجاعص) نے لکھا،

دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس[2] کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفے، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود امی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبد اللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر، اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا، اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے، اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ سکتی ہیں، حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تاکہ اقوام اسلامی کے اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی، قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے، قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر بزرگی حاصل ہے، اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا، جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے، مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کر دیا، نامسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے، تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں، اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کئے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے، بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا، اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔

انگلستان کے مشہور انشا پرداز کارلائل نے اپنے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار محمد آپ کی نسبت کہتا ہے،

"قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔"[3]

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کئے اور اصلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور

---

[1] لائف آف محمد، ا، گولیو تھ صفحہ ۲۹۱ [2] مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے [3] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون "قرآن" ج ۱۵ ص ۵۹۸۔

عمل سے نہ ہوگئی ہو، اور یہ اس لئے کہ تمام انبیاء میں خاتم نبوت، اکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی واخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی، حالانکہ آپ نے فرمادیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں[1] صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیئے، حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے، آپ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو،[2] نبوت محمدی کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے، عرب کے بدویوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے آپ کی بعثت تھی، اس لئے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایات ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے، لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آداب تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار، انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

آپ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، چار ابواب پر منقسم ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ نے بتایا ہے کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ یا یوں کہو کہ اس کا ایک رُخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت، اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان، آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے، اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قولی اور قلبی حالات سے ہے، تو اس کا نام عقیدہ ہے، اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ، ہمارے جسم و جان اور مال و جائیداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں اور انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے، اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں، اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور ان کی

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبیین و جامع ترمذی کتاب الامثال [2] جامع ترمذی و سنن ابی ماجہ کتاب الطہارت۔

حیثیت قانون کی نہیں، بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے، اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے کی بجاآوری کا نام عمل صالح ہے اور ان ہی دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے، عمل صالح کی تین قسمیں ہیں، خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الٰہی کی پابندی، اور ان کے ساتھ محبت الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ، اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے، الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لئے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

★

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک، ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا۔

الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب (صحیح بخاری کتاب الایمان)

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قَلْبٌ سَلِيْمٌ (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قَلْبٌ اٰثِمٌ[1] (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قَلْبٌ مُّنِيْبٌ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے تمام اعمال کا محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا۔

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری آغاز کتاب)

تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ نے یوں ادا فرمایا۔

انما لامرئ ما نوی فمن کانت ھجرته الی دنیا یصیبھا او الی امرأة ینکحھا فھجرته الی ما ھاجر الیه۔ (صحیح بخاری آغاز کتاب)

ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہۃً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے، اب صحیح اور صالح عمل کے لئے

[1] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (بقرہ - ۳۹)

ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں،

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے نہ تسلیم کرلیں،

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے اس پابزنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پاسکتے، اگر پاسکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ "عمل صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے، جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے، عبداللہ ابن جدعان ایک قریشی تھا، جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے، مگر باایں ہمہ مشرک تھا، اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یارسول ﷺ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے کیا ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا نہیں اے عائشہؓ! کیونکہ کسی دن اُس نے یہ نہیں کہا کہ بارالٰہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دیجئے۔

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ اے محمدؐ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے۔ فرمایا کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا، نہیں، فرمایا واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں۔ دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی، مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔ اس نے پھر نفی میں جواب دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا، غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا، تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے؟ تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نور اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا، اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۣ	جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے
اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا	جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی

لے مصنف ابن ابی شیبہ غزوات نسخہ قلمی دار المصنفین و ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۴۹ مصر۔ ے صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ۱۰۶ مصر۔

كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ (ابراہیم ۳)
فائدہ نہیں اٹھاسکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (نور ۵)

اور جنھوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش وحواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے۔

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا ۗ وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ (نور ۵)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو، اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو۔ اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے، جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لئے نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہوسکتی، اسی لئے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جاسکتی، وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے تو اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (البقرہ ۳۶)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور کہنے دے کر اس طرح نہ برباد کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا، پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، ذرا اس پر پانی برسا اور مٹی دھل کر پتھر رہ گیا، جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اُگے گا نہیں اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی، کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض وغایت ہے، یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں، وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کام

کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات و پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے۔ انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی بھلائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لئے نہیں بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لئے اور خوارق عادت پر قدرت اور اعتبار پانے کے لئے۔[1] اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی، مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا، عیسائیوں، زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتا پا خیالی فلسفہ بن گئے، جس سے تصوریت عملیت پر غالب آگئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے لئے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد، اخلاق و عبادات کی اساس قرار پاسکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کئے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال، جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس جہان کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلہ مقصود قرار پاسکے اور اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں، ہمارے دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہوں اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے، اگر ان کی صداقت، سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور تمیز، ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے نہیں ہوگی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم

[1] متی۔

اور ہر لحظہ لکھتے جاتے ہیں، تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ واکاز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے، ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جاتے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو، اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیا سے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے، اس لئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے، بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا، یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ...... — جو لوگ غیب (خدا، خدا کی صفات اور ملائکہ) پر ایمان رکھتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ (بقرہ۔۱) — اور جو کچھ تم پر (اے محمد) اترا اور تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیاء اور ان کی کتابوں پر)

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (بقرہ۔۱) — اور آخرت (روز جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (بقرہ۔۲۲) — اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر، فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔

سورہ کے آخر میں ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقرہ۔۴۰) — پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان لائے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (نساء۔۲۰) — اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری، اور جو شخص خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان

آمن باللہ

ایک قادرِ مطلق اور ہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین، اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدیؐ کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا، مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصابِ درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف و حقائق جسمانی اور اعمال و اخلاق کا سرِ بنیاد قرار دیا، خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (نساء - ۱۸)

یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔

پھر اسی کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسماء و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل تعلیم محمدیؐ کی امتیازی شان ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ نبوتِ محمدیؐ کی غرض و غایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا بلکہ ایک زندہ قوم، جد وجہد اور عمل والی قوم، اخلاص و ایثار اور نیکی و تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا، اور اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لئے نمونۂ عمل بنانا تھا، اس لئے سب سے پہلے اہلِ عرب کو جو اس کے مخاطبِ اول تھے، رموز و اسرارِ توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لئے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے، ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاحِ عقائد معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لئے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و موثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرامِ فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پُر زور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان، غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں

ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود ہیں اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استیصال کیا، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا۔ اسی طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً صفت خلق اور احیاء و اماتت برہما، بشن، مہیش کے نام سے موسوم ہیں، مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیاء اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی، یمین و شمال، نرم و سخت، رات دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فسق و صلاح کوئی چیز معاملہ اور تضاد سے خالی نہیں، اس لئے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کئے اور ان کا نام یزدان اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام، نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوا تھا لیکن شرک کا استیصال کلی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں، تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک اور ابطال اور رد کیا ہے، اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ فعال خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا، ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لئے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے، ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمال مصوری پر اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر۔ اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور برا لیا جائے تو شر ہے۔ زہر نہ اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور اگر کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، نہ کوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہے نہ کوئی شر محض، اسی لئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے۔

أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (جن-۱)

آیا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ (نساء-۱۱)

تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا

کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی تم ان کو پہنچا چکے ہو

قُلْتُمْ اَنّٰی ھٰذَا، قُلْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (آل عمران-۱۷)

تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی، کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، شر نہیں ہے، ان میں اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لئے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں، البتہ جب کوئی شریر ان دواؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے، حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں ہی نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لئے الگ اور بری چیزوں کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنَ وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (نحل-۷)

اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ ایک ہی خدا ہے تو مجھی سے ڈرو اور اسی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

(۲) شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص، کسی خاص شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چندر، کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر قرآن مجید میں نہایت پر زور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی۔

یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ، اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (نساء)

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھو اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے، مسیح یعنی عیسیٰ بن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔

لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ یَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیَسْتَكْبِرْ فَسَیَحْشُرُهُمْ اِلَیْهِ جَمِیْعًا (نساء-۲۴)

مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہے، اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (مائدہ-۳)

وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں کہہ دو کہ اگر خدا چاہے کہ مسیح بن مریم کو، اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک دے اور خدا ہی کے لئے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں سب کی حکومت ہے وہ جو چاہے کرے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ، مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ

اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو، عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ میری یہ مجال کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں، اگر میں نے کہا ہوگا تو تو جانتا ہوگا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا، تو بڑا غیب دان ہے، میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ

أَمَرْتَنِيْ بِهٖ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ (مائدہ-۱۶) | کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت کرو، جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ حاصل کون و مکان تھے، لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف-۱۲) | کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے، جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں مثلاً حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے، اور حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ اشرف انبیاء تھے، آپ کا کیا لقب تھا؟ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا ہے، صرف رسالت اور عبدیت کا۔

أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ۔ | میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی، اس پر یہ آیت اتری[1]۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (آل عمران) | تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہشمند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (قصص) | تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ-۱۰) | تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی نسبت اس طرح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے۔

لا تطرونی کما اطرت الیہود والنصاریٰ۔ | میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔

ایک دفعہ آپ راستہ میں جا رہے تھے، ایک شخص نے دفعتہ آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ نے فرمایا ڈرو نہیں، میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں، جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہمارے سید آقا ہیں

---

[1] بخاری غزوۂ احد، یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔ [2] بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ توبہ [3] بخاری جلد اول کتاب الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم [4] شمائل ترمذی و مستدرک جلد ۳ ص ۴۸ علی شرط الشیخین و قد فتہ مکہ۔

آپ نے فرمایا، سید خدا ہے۔ لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپ نے فرمایا اچھا، کہو دیکھو کہیں تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنائے[1]۔ اصلی الفاظ یہ ہیں۔ قولوا بقولکم ولا یستجرینکم الشیطان۔

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا، اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپ نے فرمایا، لوگو، پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گرنے نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے، مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ[2]۔

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں، مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد

(۳) شرک کا اصلی منزلہ یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا درکار ہے، اس کا رُخ دوسری جانب بدل جاتا ہے، ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں ان ہی دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں، ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہیں، ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، غرض براہِ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے، خود مسلمانوں میں ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کا طرزِ عمل انبیاء و صلحاء، بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے، اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (ممتحنہ-۱) — میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت مانگی تھی، وہ نہیں ملی، البتہ درخواست ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کر لوں[3]۔

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا، اے قریشیو! اے اولادِ عبد المطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں، لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا[4]۔

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا اُولٰٓئِكَ — کہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کو ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے، جن کو یہ لوگ

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب ہل یقول سیدی و ابوداؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح [2] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۵۳ [3] صحیح مسلم کتاب الجنائز
[4] یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (بنی اسرائیل - ۶)

پکارتے ہیں، وہ بھی زیادہ قرب حاصل کرنے کے لئے خود خدا ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

(۴) شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارق عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں، ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے اور نہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرت انسانی سے بالاتر ہیں، یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے، حضرت عیسٰی علیہ السلام اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائص نبوت میں ہے، تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا، قرآن مجید میں اس کے متعلق حسب ذیل امور بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) معجزات صادر ہو سکتے ہیں، اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (انعام - ۴)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا، کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲) باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد - ۱)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت) پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا، تم تو صرف ڈرانے والے ہو، اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۱۰)

اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہریں جاری کر دو، یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو، جیسا کہ تمہارا گمان تھا، یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ، یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتار دو جس کو ہم خود پڑھیں، کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔

(۴) جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کیے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں، تاہم خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو جواب تلقین کیا، وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (عنکبوت - ۵)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر ان کے خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے، کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان (کفار) کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے اس میں بے شبہ ایمان والوں کے لئے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔

اسی لئے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے

(۶) شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیاء یا پیشوایانِ مذہبی کو تحریم وتحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری۔

اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا (توبہ - ۵)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے۔

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں، عرض کی کہ ہاں، آپ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے۔[1] عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تاسیس، حلال وحرام کی تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر ونواہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذات نبوی کی صفت رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران - ۵)

محمد تو صرف ایک رسول ہے، اس سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ (نساء - ۲۳)

مریم کا بیٹا عیسیٰ اللہ کا صرف رسول تھا

اس حصر سے مقصود یہ ہے کہ انبیاء میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت اور نبوت کے اوصاف ہیں۔

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

(۷) شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے، سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایانِ

[1] جامع ترمذی وابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

15

دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے، اور سلاطین و امرا۔ کو تو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنو اسرائیل میں سجدہ تعظیمی یا سجدہ محبت جائز تھا، چنانچہ حضرت یوسفؑ کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا، لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا، سجدہ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا، ایک دفعہ ایک صحابی خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہل عجم کو دیکھا ہے وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں، آپ نے فرمایا تو کیا میری قبر پر گزرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے، عرض کی نہیں، فرمایا تو اب بھی نہ کرو، اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[1]، اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے، تو آپ کو سجدہ کیا، آپ نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں، فرمایا ایسا نہ کرو، اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[2]۔

صفات الٰہی کی توحید

(۸) شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کئے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علم غیب ہے، اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے، کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتا جاتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید اور استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں، خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ (انعام ۷) اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ مفاتح غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا[3]۔

(۱) حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی،

(۲) کل کیا ہوگا،

(۳) بارش کب ہوگی،

(۴) کس جگہ موت آئے گی،

(۵) قیامت کب آئے گی،

اگرچہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں،

یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں، گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا،

---

[1] ابو داؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ [2] ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ [3] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیۃ میں بہ تفصیل مذکور ہے

وفینا رسول یعلم ما فی غد۔ — اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو، وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں، اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (انعام-۵) — کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل-۵) — کہہ دے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع و فریب کا جال پھیلاتے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی، بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے، صحابہ نے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے، فرمایا "اب نہ جایا کرو"، عرض کی، ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے، فرمایا یہ تمہارا وہم تھا، اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ آیا کرو، بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں، فرمایا شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو باتیں جھوٹ ملا دیتا ہے، کبھی فرمایا کہ فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سیکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں، جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں، عرب ان کو عرّاف کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی عرّاف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔[۳] علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے ہیں، آپ نے ان کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا ہے اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمدؐ پر جو کچھ اترا ہے اس سے انکار کرتا ہے۔

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی، فال، شگون، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدا عانہ طریقے مٹ گئے، پرندے اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا، اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

مخفی قوتوں کا ابطال

(۹) کائنات میں خدا کے سوا ان غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم، جنات و شیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا، اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا، اور دعا و

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں بتفصیل مذکور ہے۔ [۲] صحیح بخاری کتاب النکاح۔ [۳] مشکوٰۃ باب الکہانۃ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث ابوداؤد، ابن ماجہ اور احمد سے کی ہے۔

کلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے، ٹوٹکے، جن میں کسی غیرِ خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا تھوڑا ہو کفر قرار پائے، اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لئے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ (فاتحہ)

(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

سحر وطلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشادِ خداوندی ہوا۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔

یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے اور یہ بیہودہ وہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں، فرمایا۔

یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی۔ (طٰہٰ - ۳)

مصری جادوگروں کے جادو سے یہ اس کو خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل کا حکم دے دیا[1] تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو، اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں وہ بالکل بے بس ہیں۔

ابو داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو، اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، ایک صحابی نے ایک بیمار پاگل پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کی وہ اچھا ہو گیا، اس نے ان کو انعام دیا، انہوں نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ عرض کیا، فرمایا کہ، میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچی جھاڑ سے روزی کھائی، ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

ان الرقی والتمائم والتولة شرک۔ (ابو داؤد و ابن ماجہ)

بے شک جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے بھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔

ان ہی صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی، گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگہ پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا، وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی، انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا، پھر فرمایا کہ عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے بھڑانے کے تعویذ شرک ہیں، ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا جب میں جھاڑتی

---

[1] جامع ترمذی باب ما جاء فی حد الساحر و ابو داؤد باب اخذ الجزیۃ من المجوس۔

تھی تو پانی رُک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا، انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے، تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں "اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ ہو"

اوہام وخرافات کا ابطال (۱۰) وہ تمام اوہام وخرافات جن سے مشرک اہل عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات موثر اور متصرف سمجھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمایا کہ ان کی کوئی اصل نہیں، فرمایا:

لا عدوی ولا طیرۃ ولا صفر ولا ھامۃ	نہ چھوت ہے، نہ بدفالی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے،
(ابوداؤد وابن ماجہ)	نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

العیافۃ والطیرۃ والطرق من الجبت۔	پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری
(ابوداؤد وابن ماجہ)	پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔

ایک اور صحابی آپ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ فال نکالنا شرک ہے، پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو برا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے[1]، یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نچھتر" (نوں) کچھ نہیں[2] یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں، اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے، ان کو آپ نے ایک لفظ سے باطل فرما دیا، فرمایا:

لا غول (ابوداؤد باب فی الطیرۃ)	غول بیابانی کچھ نہیں۔

بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا، سورہ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی اور سورہ مائدہ میں فرمایا گیا:

مَا جَعَلَ اللّٰہُ مِنْ بَحِیْرَۃٍ وَّلَا سَآئِبَۃٍ وَّلَا وَصِیْلَۃٍ وَّلَا حَامٍ (مائدہ۔۱۴)	خدا نے بحیرہ، اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔

بحیرہ، اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ، اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ، بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہوا تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے، پھر اگر نر و مادہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے، یہ وصیلہ تھا۔

حام، وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو جاتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استیصال فرمایا، یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے، یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے

---

[1] یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم باب التمائم و باب ما جاء فی الرقی اور ابن ماجہ باب تعلیق التمائم میں ہیں۔ [2] ابوداؤد وابن ماجہ ذکر فال۔ [3] ابوداؤد وماجہ

ہیں مثلاً بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹونے ٹوٹکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں، اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً

(۱) عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند اور سورج میں گرہن لگتا ہے، آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے جب انتقال کیا تو سورج گرہن لگا ہوا تھا، لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں، کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔[۱]

(۲) یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

(۳) ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، ایک ستارہ ٹوٹا، آپ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا مرجاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔[۲]

(۴) شیرخوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ ان کو جنات نہ ستانے پائیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔[۳]

(۵) نظر بد سے بچنے کے لئے اونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے۔[۴]

الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام و خرافات کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا، اسلام کی اس اصلاح کی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات و حکایات سے کرو جنھوں نے صدیوں تک دنیا کو دیوؤں، بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا، اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

(۱۱) شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی درباری سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ ان کے درباری سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لئے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے۔

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس-۲) یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انھوں نے صاف کہا۔

---

[۱] صحیح بخاری باب صلوٰۃ الکسوف [۲] مسند ابن حنبل جلد اول ص ۲۱۸ [۳] ادب المفرد باب الطیرۃ من الجن ص ۱۸۰ [۴] مصر [۴] موطا امام مالک باب ماجاء فی نزع التعلیق والجرس من العین ص ۳۰۳۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر-۱)
ہم ان کو اسی لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے، اور محبوب ہیں اس لئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچا لیں گے، ان کا دعویٰ تھا کہ

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ-۳)
ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔

قرآن نے کہا۔

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (مائدہ-۳)
بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (اٰل عمران-۳)
ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔

قرآن نے کہا۔

وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (اٰل عمران)
اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی اور طبعی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک وصاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا، اسی لئے پوپوں کے سامنے اعتراف گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغام محمدیؐ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ)
انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ۔

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (اٰل عمران)
اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر عدل وانصاف کرے گا، قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں ان کی تردید کی ہے، قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا۔

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ-۱۶)
اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔

وہ کہیں گے بار الٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا تھا جو تو نے کہا تھا، میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی، میں نے

تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو۔ اب،

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (مائدہ ۱۶)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو بخش دے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گنہگاروں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بت پرستوں عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا، اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں، اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا، اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن مجید نے کفارہ غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقہ شفاعت کے عقائد باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (زخرف ۔ ۷)

یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔

لَّا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا (مریم ۔ ۶)

یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔

أَأَتَّخِذُ مِن دُونِهِ آلِهَةً إِن يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنقِذُونِ (یس ۔ ۲)

کیا خدا برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں، اگر رحمن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا،

وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ (نجم ۔ ۲)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لئے چاہے اور پسند کرے۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ (زمر ۔ ۵)

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کوئی شفیع بنایا ہے، کہدے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی اور شفیع بننے کے قابل ہیں۔

خدا قیامت میں ان سے کہے گا،

وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ (انعام ۔ ۱۱)

اور ہم دیکھتے نہیں، تمہارے ساتھ تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ وَلَمْ يَكُن

اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین ناامید ہوں گے کہ جن کو وہ خدا کا

لَّھُمْ مِّنْ شُرَکَآئِھِمْ شُفَعٰٓؤُا (روم - ۲) شریک کار بناتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ...... اے فرزندانِ اسرائیل۔
وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا
وَّلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْھَا اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے
عَدْلٌ وَّلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ (بقرہ - ۶) بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ..... اے فرزندانِ اسرائیل .....
وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے
شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْھَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُھَا گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت
شَفَاعَۃٌ (بقرہ - ۱۵) فائدہ دے گی۔

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے نہ رہیں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے
قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خُلَّۃٌ کچھ خرچ کر دیا کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین
وَّلَا شَفَاعَۃٌ (بقرہ - ۳۴) ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے۔

غرض آپ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ شُفَعَآءَ قُلْ کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ گو
اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ٭ قُلْ ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو، اور نہ ان کو سمجھ ہو تو بھی کہہ دے کہ شفاعت
لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا کل اختیار خدا ہی کو ہے، اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے،
ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (زمر - ۵) پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدہ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدہ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے۔

وَلَا یَمْلِکُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ الشَّفَاعَۃَ اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا
اِلَّا مَنْ شَھِدَ بِالْحَقِّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جنھوں نے حق کی گواہی دی اور
(زمر - ۷) وہ دانش رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے۔

لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک

الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (مریم-۶) (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے۔

لیکن اس شہادتِ حق اور عہدِ الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لئے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے۔

مَا مِنْ شَفِيعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس-۱) — اللہ کی بارگاہ میں کوئی شفیع نہیں، اس کی اجازت کے بعد۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ-۳۴) — وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کرسکے، لیکن اس کی اجازت سے۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْضٰى (نجم) — اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آسکتی، البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (نباء-۲) — یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کرسکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہوسکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا، فرمایا۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا-۳) — اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی لیکن اس کے لئے جس کے لئے وہ شفاعت کی اجازت دے۔

يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا (طٰہٰ-۶) — اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لئے خدا اجازت دے اور اس کے لئے بات کرنا پسند کرے۔

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش ان ہی کی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا، فرمایا۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (انبیاء-۲) — اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے۔

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لئے ازل ہی سے یہ اعلانِ عام ہوچکا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم ہوگئے۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (مدثر-۲) — تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (مومن-۲) — ظالموں (مشرکوں) کا نہ کوئی دوست (اس دن) ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا، مشرکین ہیں، جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ (نساء-۱۸) — اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔

لہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان-۲) بے شک شرک بڑا ظلم ہے (دیکھو بخاری ذکر لقمان جلد ا صفحہ ۴۸۷)۔

لیکن اب ایسی حالت میں صرف وہی شفاعت کر سکیں گے، جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی ان ہی کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا، یا صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفتِ کریمی و رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (انعام-۵)

اور اس قرآن کے ذریعہ اے پیغمبر ان لوگوں کو ہشیار کردے کہ اس سے ڈرتے رہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے، ان کے لئے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں۔

مَا لَكُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ (السجدہ-۱)

خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں، پھر کیا تم سوچتے نہیں۔

خدا کی اس صفتِ کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آتے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور دنیا والوں کے ساتھ ہے، ان انبیاء کی بعثت ہوتی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے، اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضلِ عمیم کے مظہر قرار پائیں گے نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الٰہی نے چاہا ہو، اس منصب پر ممتاز ہو سکیں گے، خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو اس دنیا میں رحمۃ للعالمین اور خدا کی صفتِ رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

اجرامِ سماوی کی قدرت کا انکار

بظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلافِ موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا،

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (۵)

سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ-۳)

ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں "فلکِ کج رفتار" اور "دہرِ ناہنجار" کی شکایت اب تک چلی جاتی ہے عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلافِ توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے[1]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا، اور فرمایا کہ زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے[2]، اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ زمانہ کو برا کہتا ہے زمانہ میں ہوں، میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں[3]، یعنی زمانہ کو جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ برا کہتے ہیں، حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے، اسی لئے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

---

[1] فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ صفحہ ۴۴۴ و کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۵۱۱ الہ آباد۔ [2] صحیح مسلم الفاظ ادب۔ [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ جاثیہ و کتاب الرد علی الجہمیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۱۶۔

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو نچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں نچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا، حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی، صبح کو نماز کے بعد آپ صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا، صحابہ نے عرض کی کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے، ارشاد ہوا اس نے فرمایا آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے اور کچھ کافر ہو کر، جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں، اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں نچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں[۱]۔

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے، کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کئے جاتے تھے، ۱۰ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے وفات پائی، صحابہؓ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اس خیال کی تردید کی، فرمایا کسوف و خسوف (گرہن) کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے[۲]۔

غیر خدا کی قسم سے روکنا

۱۲۔ شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے، قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں، جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو در اصل داقو پر گواہ بنایا جاتا ہے عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں چنانچہ کفار قریش اپنے دیوتا لات و عزّیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا[۳]، لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ نے فرمایا کہ جس شخص کی زبان سے لات اور عزّیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الٰہ الا اللہ کہہ دے، یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے سنا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو، جس کو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی[۴]، ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے اگر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو[۵]، ایک دفعہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا[۶]، دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے[۷]۔

---

[۱] صحیح بخاری باب الاستسقاء و باب الذکر بعد الصلوٰۃ و صحیح مسلم کتاب الایمان [۲] صحیح بخاری صلوٰۃ الکسوف [۳] سنن نسائی کتاب الایمان والنذور [۴] یہ تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم، نسائی کتاب الایمان میں مذکور ہیں [۵] نسائی کتاب الایمان والنذور [۶] جامع ترمذی ابواب النذور والایمان و مستدرک حاکم ص ۱۸ ج ۴، کتاب الایمان [۷] مستدرک بحوالہ مذکور۔

خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں

۱۴۳۔ اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت، عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہلِ توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے، اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے، تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں، اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت، عالم کے کاروبار میں شریک نہیں، لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا، توحید کامل کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی، اور قرآن مجید نے جابجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیتِ الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسنِ ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرزِ کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا اس قسم کا طرزِ کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جاتے تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آکر مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ شرک کرتے ہو کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہیں، آپ نے صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا یوں کہو کہ وہ ایک ہے جو چاہے، پھر جو آپ چاہیں۔[1] یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان کیسے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمد جو چاہیں، ان صحابی نے خدمتِ اقدس میں آکر اپنا یہ خواب بیان کیا، آپ نے فرمایا میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا، یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمد چاہیں۔[2] ابوداؤد میں بھی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے[3] کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے، بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے، لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں[4] اور بیہقی نے کتاب الاسماء[5] میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیئے، ایک شخص نے خدمتِ والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں، ارشاد ہوا کہ تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا، جو خدا تنہا چاہے، مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ۔

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدِ نظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے کہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا، جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی، یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا، اٹھ جاؤ تم برے خطیب ہو، آپ نے آزردگی کا اظہار اس لئے فرمایا کہ ان دونوں کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لئے خطیب کو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ ۔۔۔۔ جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، اور ماثورہ خطبوں میں بھی منقول ہے۔

---

[1] نسائی کتاب الایمان والنذور۔ [2] ابن ماجہ کتاب الکفارات۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب باب لا تقولوا خبثت نفسی۔ [4] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۰۵ مصر کتب۔ [5] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی صفحہ ۱۰۱ مطبوعہ الہ آباد۔

مشبہات شرک کی ممانعت

۱۵۔ جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا، ان سے بالکل منع کر دیا، لوگ اولاد کا نام آفتاب، ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً عبد الشمس، عبد مناف، ان ناموں سے سخت منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں[1]، اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے[2]، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا، خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں (حاکم فی المستدرک ص ۲۷۵ ج ۴)

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے، حالانکہ رب خدا ہے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے، بلکہ یوں کہے کہ میرا بچہ یا بچی اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں، مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب اللہ ہے[3]، ہانی ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابو الحکم تھی، وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ نے فرمایا کہ حکم خدا کا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے، تم کو لوگ ابو الحکم کیوں کہتے ہیں، عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپ نے فرمایا، تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں، بولے شریح، مسلم، عبد اللہ آپ نے پوچھا، سب میں بڑا کون ہے، عرض کی، شریح۔ فرمایا تو تمہاری کنیت ابو شریح ہے[4]۔

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، گویا اس نے برائی کرائی، ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرتؐ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، انہوں نے کہا شیطان کا برا ہو، آپ نے فرمایا یوں نہ کہو، ورنہ شیطان غرور سے پھول جاتا ہے اور کہے گا، میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو، تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا[5]۔

تصویر بنانے سے سخت منع کیا، اس کی یہی وجہ تھی کہ اول اول لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان ہی تصویروں کی پرستش ہونے لگتی تھی، چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھلک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا

۱۶۔ شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے، قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر بھیڑیں بناتے ہیں، قبے باندھتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام افعال سے منع کیا ہے، وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا، عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا[6]۔

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے

۱۷۔ یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال، اور روزمرہ کی بول چال سے تھا، لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے وہ قلب و روح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے، کوئی طلب شہرت کے لئے کام کرتا ہے، کوئی دنیاوی

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب تغییر الاسماء۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب باب الکریم وحفظ المنطق۔ [4] ابوداؤد کتاب الادب باب تغییر الاسم القبیح۔ [5] ابوداؤد کتاب الادب باب لا یقول خبثت نفسی۔ [6] صحیح مسلم کتاب المساجد۔

معاوضہ کے لئے کرتا ہے کوئی نمائش اور دکھاوے کے لئے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے، ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے، جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے کہا،

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (فرقان ۔ ۴) تم نے ان کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے۔

اسی لئے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے، اس بت کو توڑنا توحید کی اصل تکمیل ہے آپ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے، انما الاعمال بالنیات اس لئے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہئے جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی اس کے ایمان و توحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بنا پر محمد ﷺ نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض و غایت مرضاۃ اللہ اللہ کی خوشنودی مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ مخلص اور وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ذات خدا کو قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض و نیت سے کرے تو درحقیقت اس کام کے لئے اس نے ایک موقت خدا الگ بنا دیا گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں لیکن معنوی و نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے، آپ نے فرمایا، جس نے خدا کے لئے دیا اور خدا ہی کے لئے روکا، خدا کے لئے چاہا، اور خدا ہی کے لئے عداوت کی اور خدا ہی کے لئے بیاہ کیا، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔[۱]

متعدد صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ریا چھپا ہوا شرک ہے، حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی موجودگی کے سبب سے کرے،[۲] حضرت شداد بن اوس روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔[۳] یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں آپ فرما رہے تھے کہ مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے، ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لئے عمل نہ کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں۔[۴] حضرت محمود بن لبید انصاریؓ آپ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے، وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، شرک اصغر کیا ہے، فرمایا، قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا، خدا ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے یہاں کچھ نہیں، تم ان ہی کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے۔[۵] حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے، کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں، ہم سب نے عرض کی ہاں، یارسول اللہ صلی اللہ

---

[۱] مستدرک حاکم و ترمذی آخر کتاب الزہد، ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو مختلف درج ہیں، ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن اس کے ایک راوی عجلی کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے گو حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے [۲] حضرت ابو سعید خدریؓ، معاذ بن جبل، ابوہریرہ، شداد بن اوس، محمود بن لبید، ابو سعید بن ابی فضالہ ان صحابیوں کی روایتیں [۲] مسند ابن حنبل، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ میں ہیں [۳] مستدرک حاکم کتاب الرقاق ص ۳۲۹ ج ۴ و صحیح [۴] مجمع الزوائد بحوالہ ابن ماجہ مستدرک ابن حنبل، مسند شداد بن اوس ص ۱۲۶ ج ۴ [۵] سنن ابن ماجہ باب الریا والسمعہ [۶] ابن حنبل مسند محمود بن لبید انصاری ص ۴۲۸ ج ۵ و ابو داؤد و مسند ابن حنبل۔

علیہ وسلم، فرمایا وہ شرکِ خفی ہے[1]، یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے، تو وہ نماز کو محض اس لئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے[2]۔ ابوسعیدؓ بن ابی فضالہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا تو ایک منادی آکر پکارے گا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اسی غیر سے مانگے کہ خدا سب سے بے نیاز ہے[3]۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں، تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرلیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا[4]۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرکِ خفی سے ڈرتے تھے، شدادؓ بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں ریا کو شرکِ اصغر گنا کرتے تھے[5]۔ ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ جارہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذؓ بن جبل صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے[6]۔ اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شدادؓ بن اوس صحابی اپنی جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں، رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کی کہ میرے ماں باپ حضورؐ پر فدا ہوں، اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے ارشاد ہوا کہ میں اپنے بعد بھی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں، عرض کی یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ فرمایا شرک اور چھپی نفسانی خواہش، میں نے دوبارہ گزارش کی یا رسول اللہؐ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا اے شداد! میری امت یقیناً سورج، چاند، بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی، لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی، عرض کی یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے، فرمایا ہاں[7]۔

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے، اور یہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے، اب دل نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کرلی۔

*

---

[1] سنن ابن ماجہ باب الریا والسمعہ [2] سنن ابن ماجہ باب الریا و ترمذی و مسند ابن حنبل [3] ابن ماجہ باب الریا [4] مستدرک حاکم کتاب الرقاق ج ۴ ص ۳۲۹ دیمن [5] مستدرک، حاکم کتاب الرقاق ج ۴ ص ۳۲۹ [6] ایضاً [7] مستدرک حوالہ مذکور، حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے مگر ذہبی نے تصریح کی کہ اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے، تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۱۲۶ اور سنن ابن ماجہ باب الریا میں دیگر سلسلوں سے مذکور ہے جس میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لئے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید
اور
اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد وخیالات کی نفی اور تردید، لیکن نبوت محمدیؐ کا کارنامہ اس سے اہم اور بالاتر ہے، اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے عرب میں شرک، بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں، مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہوسکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دے دیا گیا تھا، یک قلم محو کردیا، بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹادیں، اور ان کی جگہ مرتب، متیقن، سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی، جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لئے ان کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی تھی، جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کے لئے تھی، اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدیؐ کے بعد عقل انسانی تحقیق وتلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی، اور قدرت کے سربمہر خزانے وقفِ عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل وثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل وبراہین وثبوت اور عوام امر کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے، جن میں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام طبقوں اور قوموں کے لئے ہوئی، اس لئے آپؐ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپؐ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادرِ مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں، اس لئے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا، بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، متشککوں، دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین وتشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادرِ مطلق، خالق عالم اور صانعِ کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتی رہی

دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں، مصر، یونان، ہندوستان، اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے اس بنا پر وحیِ محمدی نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے اور نہایت موثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحیِ محمدیؐ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جس میں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی، ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے، وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اسی لئے وحیِ محمدیؐ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (روم-۴)	اپنا رخ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ[1]	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا، اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے قرآن نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا (اعراف-۲۲)	اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا ہاں ہم گواہ ہیں۔

انسان کا یہ جذبۂ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے، وحیِ محمدیؐ نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی زیرِ خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا دھرا یاد دلایا ہے، وہ انسانوں سے پوچھتی ہے۔

أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (ابراہیم-۲)	کیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے۔

ایک اور مقام پر اس نے کہا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۝ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ (سورہ ...)

کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا ان ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے بہرحال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ کس کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں، نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلۂ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا، اور اولین نر و مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے۔

یہ گوناگوں عالم، یہ رنگا رنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز، انسان کی خیالی خود پرداز اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (آل عمران ۲۰)

آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار، اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلق ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (فصلت ۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے رات، دن اور سورج اور چاند ہیں۔

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر، تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا، مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں، جس طرح فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں، وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں، اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں، جہاں پیداوار اور زمین کی نشو و نما کی حاجت ہے اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسا ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ

بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لئے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مرے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں

فِیْہَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (بقرہ - ۲۰)

اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں کے پھیلانے میں اور ہواؤں کے کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر چلنے میں اور آسمان و زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں ان سب میں کچھ بوجھ والوں کیلئے بڑی نشانیاں ہیں۔

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (جاثیہ)

بے شک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل، پھول، میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

وَھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِہٖ نَبَاتَ کُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْہُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْہُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِھَا قِنْوَانٌ دَانِیَۃٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِھًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِہٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِہٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِہٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (انعام - ۱۲)

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز کونپلیں نکالیں، جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدا جدا شکل کے جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو بے شک ان میں ایمان والے لوگوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کو دلیل بتایا ہے، پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں، ایک ایک کر کے پیش کیا ہے، اول تو خود انسانوں کی پیدائش پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر، پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے، پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا اور اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں دلیلیں ہیں، اور اس

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ، وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ، وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ (الروم ۳)

کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے، اس میں جاننے والوں کے لئے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا، اور تمہارا اس کی مہربانیوں کو تلاش کرنا ہے، اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے، جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی (رحمت کی بارش کی) امید رکھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

اس آخری آیت میں آسمان اور زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے، تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں، لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورہ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوت کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے، اس کے بعد ایک جاندار و بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ، وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (لقمان ۱)

اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کئے۔

سورہ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) سے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعۃً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں روح پھنک جانا، اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا، ان سب کو اپنی صنعت میں پیش کیا ہے۔

اَلَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (سجدہ ۱)

وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی، اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے، تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودلیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا۔ انسان کی زندگی اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قوی اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمہ ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔ (ذاریات۔۱)	اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر، کیا تم نظر نہیں کرتے۔

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے، وہ بھی غور کے قابل ہے، ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اس کا کچھ حصہ لید اور گوبر کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے، اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ (نحل۔۹)	اور تمہارے لئے جانوروں میں عبرت ہے ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں کے لئے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں

ایک ہی قسم کے پھل ہیں، اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

وَمِن ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (نحل۔۹)	اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہیں، اس میں سمجھ والوں کے لئے دلیل ہے۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُّنِيرًا (فرقان)	بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا۔

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون سے اس کی گواہی دیتی ہے۔

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (نمل۔۷)	اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط نظام پر بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے۔

مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ ۖ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (ملک۔۱)	تجھے مہربان خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر، کیا کوئی فتور دکھائی پڑتا ہے، پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ درماندہ ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پاسکے گی)۔

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں، جن کا استقصار بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل،

(۱) قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا،

(۲) عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ،

(۳) کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا،

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادرِ مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے،

اہلِ فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بالمشاہدہ دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے علل و اسباب کا سلسلہ ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جاکر ختم ہوگا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا، اگر یونہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے، اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی، تسلسل عقلاً بھی محال ہے، بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے، اس بنا پر لامحالہ سلسلۂ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے، جس علت کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود و کون کی اصلی علت العلل ہے،

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے، اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے، قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے، سورۂ ہود کے آخر میں ہے،

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود-۱۰)

اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوج اور اس پر بھروسہ کر۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (نجم)

اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسانی کمزوریوں سے واقف تھے، چند صحابیوں نے آکر عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے، فرمایا، کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہوگئی ہے، گزارش کی، ہاں یا رسول اللہ! فرمایا یہ تو خالص ایمان ہے مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا مدبر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے، یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح آپ نے فرمایا، لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا، زمین کو خدا نے بنایا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں، اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا، فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے، جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے آمَنْتُ بِاللّٰهِ میں اللہ پر ایمان لایا۔[1]

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں، اس لئے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں، یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقل مند بھی ہیں جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں، اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں، وحی محمدی نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور

[1] یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے، دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا، جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اگنے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے، پھر اس کے اگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ۔ (انبیاء۔۲)

اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے، تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانین قدرت، اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے، فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو، تو یوں ہو گا کہ عالم کائنات معلول ہے اس کی کوئی علت تامہ ہو گی، یہ ظاہر ہے، ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہو سکتیں، کیونکہ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو، اب عالم کی علت تامہ اگر ایک نہ ہو، بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد، عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علت تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علت تامہ نہ ہو گی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علت تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظام عالم کی وحدت ہے، سورج، چاند اور تاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت، گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہو گا کہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں، جن میں کبھی سرمو فرق نہیں ہوتا، ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادت جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (مومنون۔۵)

اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا۔ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا۔ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ۔ (بنی اسرائیل۔۵)

کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈتے، پاک اور بلند ہے وہ (خدا) اس بات سے جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں اس (خدائے برحق) کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر ہے، بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔

اسی وحدت نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے۔

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (ملک)

تو خدا کے بنانے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر کیا کوئی خلل تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر رد ہو کر تھک کر واپس جائے گی۔

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں ہو سکتی، اسی لئے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے، یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے، ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکے، اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں؟ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین

خدا کی حقیقی عظمت اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے، مگر قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے، یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لئے پیدا کی تھی، اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا، وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولادیں تھیں، عیسائیوں کا خدا اب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا، ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی، ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لئے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے، اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں، شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج چاند، زمین، آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان، سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں، اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں، اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں، وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے، وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے اس کے مانند کوئی نہیں، اس کی شبیہ و مثال کوئی نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناطے سے پاک ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ (زمر - ۱۱)

وہ ہے اللہ تمہارا رب اس کی بادشاہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (زمر -)

آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام - ۲)

آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (انعام - ۹)

چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ (قصص - ۹)

اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (شوریٰ - ۳۰)

اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ (مومن - ۷)

وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ (انعام - ۷)

غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے، درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔

اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران - ۳)

اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (یونس - ۱۱)

اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی رد کرنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (بقرہ - ۳۴)

اللہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو لوگوں کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، سب کو جانتا ہے اور وہ اس کے علم کے حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ

جو زمین میں گھستا اور جو اس سے نکلتا ہے جو آسمان سے اترتا اور اس میں چڑھتا ہے، وہ سب کو جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ

مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ، لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (حدید)

تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو اللہ اس کو دیکھتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (فاتحہ-۱)

سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے،

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران-۹)

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے،

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ، فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (بروج-۱)

وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے بندوں سے محبت کرنے والا ہے تخت کا مالک ہے بڑی شان والا ہے جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (جمعہ-۱)

آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں،

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (اسرائیل-۸)

اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت و جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج، چاند تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا جن و انس، شجر و حجر، بحر و بر سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سربسجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگ وجود کے سازسے (اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ توحید محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالم خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں، جنات اور ارواحِ خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں انسانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زمی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے، قرآن کے ابتدائی سورۃ میں آدم کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے، اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا، اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا وہ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہ منتخب ہوا یہ منصب اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو عطا ہوا، نہ زمین کے حصہ میں آیا، نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے، صرف انسان ہی کا سینہ تھا جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا اور اسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی، فرمایا،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (احزاب-۹)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

وحی محمدی نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل - ۷)

ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت کی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔

انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوئی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (تین - ۱)

البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔

یہاں تک کہ انسان خدائی صورت کا عکس قرار پایا، متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت[1] پر پیدا کیا، اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورت الٰہی کا عکس ہے عین میدانِ جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیئے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے[2] غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا[3]، ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے علم قدرت، حیات، سمع البصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ صفات کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں، اور چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے، جس سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے اعضاء میں اسی کو فیضِ رحمانی کا مورد ظاہر کیا[4]، اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہے کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے۔

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام - ۲۰)

اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔

تو اب وہ عالم کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کے خاطر بنیں وہ روئے زمین کی چیزوں کی خاطر نہیں بنا ہے۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ - ۲)

جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو) تمہارے لئے بنایا۔

اِنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ (حج - ۹)

زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاستیذان، ابن ابی عاصم فی السنۃ والطبرانی من حدیث ابن عمر باسناد رجالہ ثقات وادب المفرد بخاری واحمد عن ابی ہریرہ و دیکھو مسلم کتاب البر، نیز توراۃ میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے، جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا، خدا کی صورت پر اسے بنایا (پیدائش - ۵ - ۲) [2] صحیح بخاری کتاب العتق، و صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ [3] صحیح مسلم کتاب البر آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے [4] ادب المفرد امام بخاری باب لا تقل قبح اللہ وجہہ اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لئے نہیں، بلکہ وہ ان کے لئے بنے ہیں، جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لئے نہیں، بلکہ وہ چاند اور سورج کے لئے بنے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لئے بنی ہے اور انسان خدا کے لئے بنا ہے، اس لئے جب کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گزاری پر معروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گزاری میں مصروف رہنا چاہیئے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند ۔۔۔ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا، تو وحی محمدیؐ نے ان سے کہا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ (نحل-۲)

اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج تمہارے لئے کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغام محمدیؐ نے ان انسانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں تم ان کے نہیں ہو۔

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا ۗ لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ (نحل-۱)

اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا تمہارے لئے جن میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔

انسانوں نے دریا، سمندر کو دیبی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ (نحل-۲)

اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تاکہ تم اس میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو چیرتے پھرتے ہیں اور تاکہ تم خدا کے فضل وکرم (روزی) کی تلاش کرو۔

آگ بھی انسانوں کی مسجود ہے، حالانکہ وہ خود ان ہی کی خدمت میں جل رہی ہے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ (یٰسین-۵)

جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس کو سلگا کر روشن کرتے ہو۔

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے، انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اسی کے لئے ہے، پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے۔

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کی تلقین کی، وہ ان ہی دو اصولوں پر قائم ہے، ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے، اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیئے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں جو ماورائے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمراں ہے، اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں، انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیئے، ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف ایک درگاہ

پر نثار ہوں، اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو

وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدیؐ نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا، مگر اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جا سکتی ہیں، کن کن باتوں سے وہ پاک ہے، اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیئے؟ اس سے کیا مانگنا چاہیئے؟ اور کیونکر مانگنا چاہیئے؟ اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہیئے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے، اس سے محبت بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جا سکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، برائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجب الاطاعۃ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے؟ اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لئے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے، کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا، عرب جاہلیت کا ایک ایک ذرہ پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کر لو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیئے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے، اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور لطف و محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض، اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے منزہ و پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ و اصلاح کے لئے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ خیر

کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسیوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کردے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے، اس کی محبت دنیا کا اصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ ان خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا، وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے۔

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران ۲۰) وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جد و جہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا، اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے، اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدار ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور ۴) وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت، خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبت الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا، خدا نے ان کی توصیف کی کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ ۲۰) ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی، ان کی صداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (طلاق ۱) جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اس کو بس کرتا ہے

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (زمر ۴) کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (احزاب ۵) اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔

ان میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء و صفت دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچی، مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے ہیں ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصول منطق کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے ہیں، لیکن ہماری صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ

صفات عوارض اور خواص کے مختلف رنگ سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ عالم ہے تو ورا الورا ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی گاہ طور اسی رمز کی تمثیلی تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی، عرب کا جاہل اللہ نام ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا، لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی وہ قطعاً بیگانہ تھا، دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا، قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی آگاہ تھے، بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ الرحمان کا لفظ بھی مستعمل تھا جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں، اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس ابرہہ کے نام سے سد مآرب پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے، عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑھ ہوگئی تھی، اس لئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کردیا، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمٰن کیا ہے۔[1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سننے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لئے رحمان کا لفظ مستعمل ہونے کی وجہ سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہوسکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا (فرقان - ۵)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے، کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں، رحمٰن کا نام ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں، اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح و ستائش کرتے ہیں۔

اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (انبیاء - ۳)

(مشرک آپ کو دیکھتے ہیں تو مذاق سے کہتے ہیں کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی نے عرب کے ناآشنایان حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء و صفات کی کوئی حد نہیں، اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جاسکتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا ... تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ (اسرائیل - ۱۲)

کہہ دو (اے پیغمبر) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

[1] صحیح بخاری جلد اول ص ۳۷۹۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے، یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام یہوؔا تھا، مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی، دوسرا عام نام ایلیم ہے، جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصافِ ذاتی اور اعمالِ ربانی کے ترجمان ہیں، تورات کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے، صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والا خدا یعنی "ربُّ الافواج" ہے، جو صرف خدا کی صفات جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں "باپ" کا لفظ خدا کے لئے استعمال ہوا ہے، اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے، گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں، ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کے صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے، عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ، باپ (خدا)، بیٹا (حضرت عیسیٰؑ) اور روح القدس حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں، باپ حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے، اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ ہیں اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا، اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی، مجرد رہ گیا ہے، اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسمِ صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں برہما، مہیش و شنو تین صفات خالق، ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی ہے، شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے، حیات، علم اور سرور یا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک، خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشانی بھیڑ بھی صفات واسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور راہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دو صفتوں ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا ہے، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا، وہ نبوتِ محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں ہے آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا ملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپ نے یہ دعا سکھائی، اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے لئے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی، خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلے سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا، تجھ سے درخواست کرتا ہوں، قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا۔

لہ یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۷ میں نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل میں بھی (بسند عبداللہ بن مسعود) ہے۔

17

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (الکہف-۱۲)	کہدے (اے پیغمبر) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے، تو سمندر ختم ہوجائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی، اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔

دوسری جگہ کہا گیا۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمان-۳)	اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہوجائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لئے ہیں، اور اسی کو زیبا ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (طٰہٰ-۱)	نہیں ہے کوئی معبود لیکن وہی اللہ اسی کے لئے ہیں سب اچھے نام۔

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لئے ہے، خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو، لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اسرائیل-۱۲)	کہدے (اے پیغمبر) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جو چاہو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (اعراف-۲۲)	اور اللہ ہی کے لئے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی کا صحیفۂ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے، قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہوا اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، وہ نہ پورب ہے نہ پچھم ہے اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوتے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچادے، اور خدا لوگوں کے سمجھانے کے لئے یہ مثالیں بیان

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (نور - ۵)

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (بقرہ - ۳۴)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (حشر - ۳)

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ

کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

اللہ نہیں ہے اس کے سوا اور کوئی معبود، وہ ہمیشہ زندہ تمام دنیا کو سنبھالے ہے، اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو، انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو وہ جانتا ہے، اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن جتنے کا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں اور زمینوں کو سمائے ہوئے ہے اور ان دونوں (آسمان و زمین) کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے، وہی اللہ جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، سب کا بادشاہ، پاک پوری سلامتی امن والا ہر شے پر گواہ غالب سب پر قابو والا، بڑائی والا، ہر اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بناتے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا، اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے اور وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے، اور ہر بات کو جانتا ہے وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ پر تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے

وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (حدید۔۱)

اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے، آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کی آل و اولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو، گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے جواب میں وحیِ محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی۔[1]

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ (اخلاص)

کہہ دے اے پیغمبر، اللہ ایک ہے وہ تنہا اور بزرگ، اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جا پناہ ہے نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ اس کے ماں باپ ہیں (جنھوں نے اس کو جنا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے، جو اس کی بیوی ہو۔

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے جو صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ صمد وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو، کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث اور جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے، اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے، غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو، اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک، اعلیٰ اور بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے، لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تعلیم سے منور ہو چکا تھا، حضرت ابوہریرہؓ آپ سے سن کر کہتے تھے کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی، اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے، اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں ایک اور صمد ہوں، جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے، اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔[2] حضرت ابوہریرہؓ یمنی عرب ہیں، یعنی اسی عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیم محمدی سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ صمد ہے، لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے، صمد کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقہ میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو، اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جان بچاتے ہیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر

---

[1] مستدرک حاکم تفسیر اخلاص (صحیح)، وجامع ترمذی تفسیر سورۃ مذکور و کتاب الاسماء بیہقی ص ۳۲ (الہ آباد)۔ [2] صحیح بخاری سورۃ اخلاص۔

مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہوسکتا ہو اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، مصمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو اسی لئے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو، صَمَدَ تُہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ "صمد" وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجہ کمال پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پرواہ، بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو وہ علم والا جس کا علم بدرجہ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی بمرتبہ کمال ہو یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو[1]

ان معنوں کے علاوہ صحابہ و تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں۔

ابن عباسؓ۔ وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصریؒ۔ وہ حی و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انسؓ۔ جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعودؓ۔ جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔

بریدہؓ۔ جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمہؓ و شعبیؒ۔ جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہؓ۔ جس سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہؓ۔ باقی غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی اسی ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں، اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، کیونکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے اصلی معنی "چٹان" کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے، اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لئے چٹان کا لفظ آیا ہے، استثنا۔ (۳۲-۳۱-۳۰) میں ہے۔

"اگر ان کی چٹان ان کو بیچ نہ ڈالتی، اور خداوند ان کو اسیر نہ کر دیتا، کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان"

یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے، سموایل کے پہلے صحیفہ میں، یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے "خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں، تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں" (۲-۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں اَحَدٌ (ایک) اور صَمَدٌ (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض

---

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی لسنہ ص ۳۴ [2] ان معانی کے لئے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی ص ۳۴ مفردات القرآن راغب اصفہانی، ابن جریر طبری، ابن کثیر اور تفسیر سورۃ الاخلاص لابن تیمیہ۔

وہ یکہ و تنہا، اکیلا، بے ہمتا، بے نیاز، بے پرواہ، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے، لیکن اسی کمال یکتائی کیساتھ وہ سب کے ساتھ سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا، یعنی سب کی پشتبان ہے، جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے،

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ۔ ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔

یہ سورۂ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لئے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے، جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے، لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انہوں نے کہا، اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوتی ہیں، جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپ نے فرمایا، بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے[1]، ایک اور انصاری صحابی تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے، تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے، ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں، لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گزارش کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے، ارشاد ہوا کہ یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی[2]، قتادہ بن نعمان ایک صحابی تھے جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور لطف حاصل کرتے رہتے تھے، لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے[3]

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی، اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آتے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا[4]، خدا طاق ہے، وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے، آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے، پورے سو کیوں نہ مقرر کئے گئے، یہ اس لئے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا، اور اس سے توحید کا رمز آشکارا نہ ہوتا، صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے، ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے، لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں، پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں، اور بعض نام ایسے جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں، اسی لئے علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے اس لئے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے ہی میں محصور ہیں بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر ابن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں، اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید [2] ایضاً کتاب الصلوٰۃ [3] مسند احمد بسند ابی سعید الخدری [4] صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم کتاب الذکر و مسند احمد بسند ابی ہریرہ و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابو عوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ۔

کہ اسماء اور صفاتِ الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے، اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغازِ مضمون میں اوپر گزر چکی ہیں، استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ کے تتبع سے علما نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کرکے گنایا ہے، یہ تمام نام وہ ہیں جو یا بطور علم اور بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں، یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے، ہم ذیل میں بترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے، علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے، لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگزر یعنی صفاتِ جمالی ظاہر ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو صفاتِ جلالی کہتے ہیں، تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامدِ عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفاتِ کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے، اور یا اس کی تنزیہہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اَللّٰہُ:- یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ:- اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے، اس کے معنی رحم والے کے ہیں، یہ گزر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا، عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا، قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے، بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے، مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو اجنبی ذاتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدتِ الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اسرائیل - ۱۲)

اللہ کہو یا رحمن جو چاہو کہو، اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں۔

لہ سید ابو شکور سالمی التول الثالث فی عدد الاسماء ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

اَلرَّحِیْمُ :- رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے، جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے، اس لئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے اَلرَّحْمٰنُ اور اَلرَّحِیْمُ خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے، کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا، وہ اس کی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے، اس عالم اور اُس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور رہے، اور ہوگا۔

اَلرَّبُّ :- پرورش کرنے والا یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔

اَللَّطِیْفُ :- لطف والا مہربان۔

اَلْعَفُوُّ :- معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْوَدُوْدُ :- محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

اَلسَّلَامُ :- امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

اَلْمُحِبُّ :- محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

اَلْمُؤْمِنُ :- امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

اَلشَّکُوْرُ :- اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول، اور پسند کرنے والا۔

اَلْغَفُوْرُ وَالْغَفَّارُ :- معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْحَفِیْظُ وَالْحَافِظُ :- حفاظت کرنے والا نگہبان، بچانے والا۔

اَلْوَھَّابُ :- دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

اَلرَّازِقُ، وَالرَّزَّاقُ :- روزی دینے والا، ہر طرح کے نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

اَلْوَلِیُّ :- دوست، حمایتی، طرف دار۔

اَلرَّءُوْفُ :- مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

اَلْمُقْسِطُ :- انصاف والا، عادل۔

اَلْھَادِیْ :- راہ دکھانے والا، رہنما۔

اَلْکَافِیْ :- اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لئے کافی۔

اَلْمُجِیْبُ :- قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

اَلْحَلِیْمُ :- بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

اَلتَّوَّابُ وَقَابِلُ التَّوْبِ :- توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگزر کرکے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

اَلْحَنَّانُ :- ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

اَلْمَنَّانُ :- احسان کرنے والا۔

اَلنَّصِیْرُ :- مدد کرنے والا۔

ذُو الطَّوْلِ :۔ کرم والا۔

ذُو الفَضْلِ :۔ فضل والا۔

اَلْکَفِیْلُ :۔ بندوں کی کفالت کرنے والا۔

اَلْوَکِیْلُ :۔ بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

اَلْمُقِیْتُ :۔ روزی پہنچانے والا۔

اَلْمُغِیْثُ :۔ فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

اَلْمُجِیْرُ :۔ پناہ دینے والا۔

اَلْمُغْنِیْ :۔ بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

صفاتِ جلالی یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے۔

اَلْمَلِکُ وَالْمَلِیْکُ :۔ بادشاہ، فرمانروا۔

اَلْعَزِیْزُ :۔ غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

اَلْقَاھِرُ وَالْقَھَّارُ :۔ جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

اَلْمُنْتَقِمُ :۔ سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

اَلْجَبَّارُ :۔ جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے، جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

اَلْمُھَیْمِنُ :۔ سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

اَلْمُتَکَبِّرُ :۔ اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شَدِیْدُ الْعِقَابِ :۔ سخت سزا والا۔

شَدِیْدُ الْبَطْشِ :۔ بڑی گرفت والا، جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ :۔ خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر توراۃ میں ہے لیکن صحیفہ محمدیؐ میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے، ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے، جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا منشا مفقود ہے کہ خدا کی ان صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گذرتا ہے بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے، وہ دور ہو جاتا ہے، فرمایا

اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (آل عمران۔۱۹) بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عَزِیْزٌ (غالب) کے ساتھ حَکِیْمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ وہیں یہ بھی کہا گیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ (ص - ٥) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمادیا۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (مومن - ٤) اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کی صفت ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ دردناک عذاب دینے والا جہاں بیان کی گئی تو اس سے پہلے لَذُوْ مَغْفِرَةٍ یعنی بخشش والا (حٰمٓ السجدہ - ٥) بھی فرمادیا گیا، غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو، تاکہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے

صفاتِ وحدانیت یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ یہ ہیں۔
اَلْوَاحِدُ :- ایک۔

اَلْاَحَدُ :- ایک۔

اَلْوِتْرُ :- طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

صفاتِ وجودی یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا و دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔
اَلْمَوْجُوْدُ :- وجود والا، ہست۔

اَلْحَيُّ :- ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

اَلْقَدِيْمُ :- وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔

اَلْقَيُّوْمُ :- جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اَلْبَاقِيْ :- جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

اَلدَّائِمُ :- ہمیشہ رہنے والا۔

اَلْاَوَّلُ :- وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

اَلْاٰخِرُ :- وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

اَلْمُقَدِّمُ :- جو سب سے آگے سے ہے۔

اَلْمُؤَخِّرُ :- جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

اَلظَّاهِرُ :- جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

اَلْبَاطِنُ :- جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

علم یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔
اَلْخَبِيْرُ :- خبر رکھنے والا۔

الْعَلِيْمُ :۔ جاننے والا۔

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ :۔ جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

خَبِيْرٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ :۔ دلوں کے چھپے ہوتے بھید کو جاننے والا۔

السَّمِيْعُ :۔ سننے والا۔

الْبَصِيْرُ :۔ دیکھنے والا۔

الْمُتَكَلِّمُ :۔ بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

الْوَاجِدُ :۔ پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔

الشَّهِيْدُ :۔ حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں۔

الْحَسِيْبُ :۔ حساب کرنے والا، یعنی چیزوں کا علم حساب کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار، ان کا بھی جاننے والا۔

الْمُحْصِيْ :۔ گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد، ان کا بھی جاننے والا۔

الْمُدَبِّرُ :۔ تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔

الْحَكِيْمُ :۔ حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

الْمُرِيْدُ :۔ ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔

الْقَرِيْبُ :۔ نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

الْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ :۔ ہر مشکل کو کھولنے والا۔

الْقَدِيْرُ وَالْقَادِرُ :۔ قدرت والا۔

الْمُقْتَدِرُ :۔ اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون چرا نہیں کر سکتا۔

الْقَوِيُّ :۔ زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

الْمَتِيْنُ :۔ مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

الْجَامِعُ :۔ جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

الْبَاعِثُ :۔ اٹھانے والا، مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا، یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اوّل۔

مَالِكُ الْمُلْكِ :۔ سلطنت کا مالک، جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

الْبَدِيْعُ :۔ نئی نئی چیزیں ادا کرنے والا۔

الْوَاسِعُ :۔ سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

الْمُحِيْطُ :۔ احاطہ کرنے والا، جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

الْمُحْيِيْ وَالْمُمِيْتُ :۔ جلانے والا اور مارنے والا۔

الْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ :۔ سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ۔ عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ:۔ نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

اَلْمُعْطِی وَالْمَانِعُ:۔ دینے والا اور روک لینے والا۔

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ۔ نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اَلْمُبْدِی وَالْمُعِیْدُ:۔ جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا، اور جو ہو کر فنا کر دی گئی اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ:۔ اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانے والا) اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا) اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا) اَلْمَانِعُ (روکنے والا) وغیرہ، ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے، ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے یعنی خدا کو صرف اَلضَّارُّ، اَلْخَافِضُ، اَلْمَانِعُ اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں، جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے یعنی اَلضَّارُّ کے ساتھ اَلنَّافِعُ، اَلْخَافِضُ کے ساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کے ساتھ اَلْمُعْطِی اور اَلْمُذِلُّ کے ساتھ اَلْمُعِزُّ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں، بلکہ ایک طرح کی برائی ہے، ہاں نقصان پہنچانے والا عزت و ذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا، اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں، یا ایسا عزت دینے والا جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور و مضطر ہوگا، اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہیہ یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور عیب و نقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اَلْعَلِیُّ۔ مرتبہ والا۔ — اَلْعَظِیْمُ۔ عظمت والا۔

اَلْکَبِیْرُ۔ بڑا۔ — اَلرَّفِیْعُ۔ بلند۔

اَلْجَلِیْلُ۔ بزرگ۔ — اَلْکَرِیْمُ۔ شریف۔

اَلْغَنِیُّ۔ بے نیاز۔ — اَلصَّادِقُ۔ سچا راست باز۔

اَلْمَاجِدُ۔ عزت والا۔ — اَلْحَمِیْدُ۔ تعریف والا۔

اَلْقُدُّوْسُ۔ پاک۔ — اَلْحَقُّ۔ سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔

اَلْجَمِیْلُ۔ اچھا۔ — اَلْبَرُّ۔ نیک۔

اَلْعَدْلُ۔ عادل۔ — سُبُّوْحٌ۔ ہر عیب سے پاک۔

اَلصَّمَدُ۔ بزرگی کی ہر صفت میں کامل۔ — اَلرَّشِیْدُ۔ سیدھی راہ چلنے والا، نہ بہکنے والا۔

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء و صفات کا عقیدہ دینِ محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے یعنی اس کے یہ محامد و اوصاف اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں، ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں، اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں، بقیہ اوصاف و محامد انسان کے لئے قابلِ نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے، اور ان کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل و پیروی کی خواہش کرے، محامدِ الٰہی گویا استادِ ازلی کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیئے، اس لئے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامدِ الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اس استادِ ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے۔

گزر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ-۴) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے، خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا، اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا، یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (بقرہ-۱۶) خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

تمام اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ اس "خدائی رنگ" سے مقصود خدا کا "دینِ فطرت" ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَىٰ صُورَتِهِ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزری ہے کہ اس "صورت" سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی شکل و صورت ہے، یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفاتِ کمال کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہیں اور ان میں حدِ بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے، اور انسان کو اخلاق و صفت میں ملاءِ اعلیٰ سے تشبیہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیائے خداشناسان خدا کے اس مقولہ تخلقوا باخلاق اللہ خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو، کا مطلب ہے، حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللہ الاعظم حسنِ خلق خدا تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں، جلالی، کمالی اور تنزیہی، صفاتِ جلالی جو کبریائی عظمت شہنشاہی اور جبروت کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں، اور نہ یہ اوصاف بندگی و عبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں، ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں، یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری اسی لئے ترفع، تکبر اور جبروت کا اظہار منع ہے اور اسی لئے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوا، اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (بقرہ-۴) اس نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

---

[1] کنز العمال ج ۲، ص ۱۲۲ بروایت حضرت عمار بن یاسرؓ

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لئے ہے، اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں،

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ہے۔

صحیح مسلم میں[1] ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے (خدا فرماتا ہے)، تو جو کوئی عزت و کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا، دوسری جگہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے بُرا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں[2]

الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (حشر-۳) اسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور وہ ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے، مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوت حق اور ربانی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرط عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں، اور سر نیاز اظہار بندگی کے لئے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت و جلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا، یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون-۱) اور عزت خدا کیلئے ہے اور اس کے رسول کیلئے اور مومنوں کیلئے ہے

حاکم میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں، وہ اپنی عزت و جلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے، تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے معزز بننا چاہتا ہے تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائے گا "اس کا مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا" (قرآن)، اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے، کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا، اور جو کبریائی کرتا ہے تو وہ خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہتا ہے، جو خدا ہی کے لئے تھی[3]

خدا کے صفات کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی و ابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے، صفات تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں، ان کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

خدا کے صفات جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لئے حسب تعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے، عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر، جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں، اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے، اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈالے گا، خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا[4]، قرآن کہتا ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (نساء-۲۱) اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی معاف کر دو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی، ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی، سزا کا منظر دیکھ کر حضورؐ کے چہرہ کا

[1] کتاب الادب باب الکبر ج ۲ ص ۳۰۰ مصر [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب [3] کنز العمال ج ۲ ص ۱۴۹ و مستدرک حاکم [4] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ۔

رنگ متغیر ہو رہا تھا، اداشناسوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو، خدا معاف کرتا ہے اور عفو و درگزر پسند کرتا ہے، تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے، وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرمارہے تھے کہ جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا، وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا، ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا:

ان اللہ عز وجل جمیل یحب الجمال۔[۲] اللہ تعالیٰ اچھا ہے، جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے، یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے، خدا جمال والا ہے، وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔[۳] یہ روایت بھی ہے خدا جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، وہ سخی ہے، سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے، صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔[۴] روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں، وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاق عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔[۵]

ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں، اے عائشہؓ! خدا نرمی والا ہے، وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔[۶] ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا، لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔[۷] عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے، وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔[۸]

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا، رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے، لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا (ابوداؤد باب فی الرحمۃ) رشتہ داروں اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں، آپ نے فرمایا کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے، خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع رحم کرے گا میں اس کو قطع کروں گا، جو تجھ کو ملائے گا، اس کو میں بھی ملاؤں گا۔[۹] ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے، میں خدا ہوں، میں رحمان ہوں، میں نے رحم پیدا کیا ہے، اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا، جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔[۱۰] پھر فرمایا، جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا، بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں، جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔[۱۱] آپ نے فرمایا: خدا نے رحم کے سو حصے کئے، ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا، اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کے لئے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔[۱۲]

---

[۱] مستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۸۲ کتاب الحدود [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبر [۳] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی [۴] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ کامل لابن عدی [۵] ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی [۶] صحیح مسلم ابوداؤد، حاکم، نسائی، ابن ماجہ بیہقی فی الادب [۷] صحیح مسلم کتاب الصدقات و ترمذی تفسیر سورۂ بقرہ [۸] ابوداؤد باب استحباب الوتر [۹] صحیح بخاری باب صلۃ الرحم [۱۰] ابواب البر والصلۃ [۱۱] ترمذی باب مذکور [۱۲] جامع بخاری باب رحمۃ الولد۔

بخل خدا کی صفت نہیں، بلکہ آپ نے فرمایا، تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو، ورنہ تم پر تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا[1]، یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا، قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا[2]، یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں رہو، خدا تمہاری مدد میں ہے۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں، اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے[3]۔ اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا کہ خدا بھی غیرت والا ہے اور مومن بھی غیرت والا ہے، اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے۔

وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (آل عمران - ۱۹) — اور بے شک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس لئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی اس کلی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا۔

یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلته بینکم محرما فلا تظالموا۔ — اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیئے، آپ نے فرمایا۔

ان اللہ طیب یحب الطیب ونظیف یحب النظافة فتنظفوا ولا تشبھوا بالیھود — خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے تو تم پاک وصاف رہا کرو یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔

یہ توحید کا ایک رخ تھا، اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں، انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا، وہ ان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام بنا چکی تھیں، یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دل سے نکال دیا، سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی، بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا، اور وہ بابل ومصر، ہند وایران کے خدا اور دیوتا اور علی ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے جن کا عزل ونصب، دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا، بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا، تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند وپست، شریف وذلیل، مختلف طبقوں اور ذاتوں

---

[1] جامع بخاری باب رحمۃ الولد [2] صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ [3] مسلم کتاب البر والصلۃ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا بان یستر علیہ فی الآخرۃ [4] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعونۃ للمسلم [5] صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۱۰۳ [6] جامع ترمذی باب ما جاء فی الغیرۃ من ابواب النکاح [7] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ ومسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۶۰ مصر وادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵ [8] ترمذی باب فی النظافۃ ص ۵۰۶ مصر

میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی، اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم ہو چکی تھی، اور زمین، قوموں اور ذاتوں کے ظلم و جبر اور غرور و فخر کا دنگل بن گئی تھی توحید نے آکر اس اونچائی نیچائی، بلندی و پستی اور نشیب و فراز کو برابر کیا، سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے، ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا، اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں۔

بہر حال اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا، جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لئے وہ مساوات انسانی کے حقیقی گوہر سے بھی اب تک نابلد ہیں، انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوت درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا اور وہ دولت و فخر اور رنگ و قومیت کے امتیازات کو خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے، مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے مساوات کی نعمت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں، اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں، دولت و فخر، رنگ و روپ اور نسل و قومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا، اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ۔ (حجرات - ۲)

تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہے۔

خدا کا ڈر اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے، عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے جس کی ہیبت و جلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہیے، اس کے گوشہ چشم میں لطف و عنایت کا گزر نہیں، محبت و پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں ہوتا، وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے، لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی کی بالکل غلط تصویر ہے، اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات اوپر گذر چکے ہیں، ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پرجلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ اور مالکیت عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں، بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار اور لطف اور کرم، رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں، مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہوں سے مغالطہ ہوا:

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

(۲) دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں، آپ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ اس کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے، غور کرو انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں، خوف اور محبت، یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ بھی

آگے پیچھے بھی، ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں، ادعائے محبت کا نتیجہ، ناز تجتر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا فساد صرف خوف کے جذبہ سے ہو سکتا ہے، اس لئے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے، بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور یہی نبوت محمدی کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے ان کے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی اور صراط مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے، یہودی مذہب کی بنا سراسر خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی، اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار[1] اور باپ کا بدلہ پشت ہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا[2]، حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے[3]، اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی، گویا ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے[4]، مگر دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا، اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے، وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ سمجھتا ہے، اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے، خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہئے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہئے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ، وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (اعراف-۷)

(لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارا کرو وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا، اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل و کرم کی) لو لگاتے ہوئے اسے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (انبیاء-۶)

وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ پر لطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے، مگر اس کو جبار و قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ:۔

---

[1] یرمیاہ ۳۲، ۱۸، ۱۵ وغیرہ [2] خروج ۲۰، ۵، ۳۴، ۷، و استثناء ۴، ۲۴، ۶، ۱۵ وغیرہ [3] خروج ۲۰، ۶ و ۳۴، ۶، ۷ و زبور ۸۶، ۱۵ و ۱۰۳، ۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے [4] لوقا کی انجیل ۱۲، ۵ اول پطرس ۲، ۲۰، دوم قرنتیون ۷، ۱، ۱ فیلیون ۲، ۱۲ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یٰس - ۱) اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (ق - ۳) جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہے۔

وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ۔ اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہوگئیں۔

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب دونوں کی جامع تھی، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں اور دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں منظر آپ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے تھے، چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں تو جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی، آپ پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت ہوتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔[1]

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے، کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم و کرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسہ ان کو خود سر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے، اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ علی الترتیب یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں ان دو متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے، فرمایا،

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف - ۹) اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوتے ہے۔

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی۔

رحمتی سبقت غضبی (بخاری) میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا، اور اپنے کو فرزند الٰہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزند الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا۔

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۳۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ۳)
ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا،

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (مائدہ ۳)
کہہ دو کہ اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے؟ اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں، بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو جن کو اس نے پیدا کیا۔

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (جمعہ ۱)
اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت یعنی خدا کی ملاقات کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمت الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے، ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی کہ خدایا مجھ کو اور محمدؐ کو مغفرت عطا کر، آپ نے فرمایا، خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا،[1] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحمت بھیج، اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا، یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔

محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس سلسلہ میں تعلیم محمدیؐ کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لئے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں، اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا، اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے، محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعے نمایاں ہوتے ہیں اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے، دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لئے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی مائیں بنیں جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے، خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے، جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اس لئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا، سدا سہاگ فقراء اسی تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا، راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ ان کے خواص تک کو گمراہ کر دیا، جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری معنوں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب [2] ابوداؤد کتاب الادب۔

میں گرفتار ہو گئے، عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا، ہندوستان کے ہندوؤں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی، سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑھیاں پہن لیں، اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے۔ اسی لئے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی، اور خدا کیلئے ان الفاظ کا استعمال ضلالت اور گمراہی قرار دیا، لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشاء کا اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے، اس کا انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے ناکافی غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے۔

فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ۔ ۲۵)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لئے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط و استوار ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحم و محبت کے اس جسمانی طریقہ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت و پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اترتی ہیں، انسانوں کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اس لئے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کیلئے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادی اور غیر جسمانی معنی کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ان دیکھی ہستی کی ذات و صفات کے متعلق جس کو خدا کہتے ہو ہر مذہب میں ایک تخیل ہے، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیرؤوں کے گرد و پیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے جہاں تک بنی نوع انسان کے لئے ممکن ہے، خدا کے متعلق باپ ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے، اسی لئے نبوت محمدیؐ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا، بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا، تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانی ہی کی مادی بولی میں کرنا تھا اس لئے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا، اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لئے اسلام نے مستعار لے لیا، اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر اس نے ربط و تعلق کا اظہار کیا اور استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آ چکی تھیں، ان سے انسانوں کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں، جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے گئے تھے ہر قوم نے اس علم اور نام کیلئے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے، وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہل لغت

کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہِ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلَہٌ سے نکلا ہے اور وَلَہ کے اصل معنی عربی میں اس غم اور محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والِہ (شیدا) مستعمل ہے، اس لئے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں، جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ ہمیشہ من موہن یعنی دلوں کا محبوب کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رحمان اور رحیم ہیں، ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں رحم والا، مہربان، لطف و کرم والا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (محبوب، مہربان رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہی صفاتِ ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے، کیا اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل ہو سکتی ہے۔

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ رحمان ہے، جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفتِ مبالغہ کا صیغہ ہے

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل - ۱۲)

اس کو محبوب (اللہ) کہو یا مہربان (رحمان) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمہاری نظر سے گزر چکا ہے، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے جلالی و جمالی اوصاف آگئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف اَلْوَدُود سورۂ ذات البروج میں آیا ہے، جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سراپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے، اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الولی ہے، جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں، خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے "الرؤف" ہے، رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے، رافت کے معنی اس محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام حنّان ہے جو حنّ سے مشتق ہے "حن" اور "حنین" اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں، دیکھو وہ ان رشتوں کے نام نہیں لیتا، لیکن ان رشتوں کے سبب سے محبت اور پیار کے جو خاص جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کو خدا کے لئے بے تکلف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے، وہ سلام (امن و سلامتی) ہے، یعنی اپنے بے پناہ بندوں کے لئے وہ سراپا امن و سلامتی ہے، وہ مومن (امن دینے والا) ہے، وہ العدل ہے یعنی سراپا انصاف ہے، وہ العفو (معاف کرنے والا) ہے، الوہاب (عطا کرنے والا) ہے الحلیم (بردبار) ہے، الصبور (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) ہے۔ التواب (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) ہے البر

(نیک اور مجسم خیر) اور المقسط (منصف اور عادل) ہے، ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کی تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے،

توراۃ کے اسفار، انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے پر محبت اور سراپا مہر وکرم سے لبریز اسماء وصفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود ونصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطیف احساس اور مہر وکرم کے جذبات وعواطف سے یکسر خالی ہے، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں، بات یہ ہے کہ اسلام ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ شرک وکفر کی اس ضلالت وگمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سراپا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس طرح وہ توحید کی بلند ترین سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شکم الٰہی کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک ومبرا ہو، روحانی حقائق کی تعبیر کے لئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا، یقیناً مادی اور جسمانی استعارات ومجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھتی، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات ومجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر وکرم اور عشق ومحبت کے تذکروں کے ساتھ ادب ولحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق ومحبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا کہ عبد ومعبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اَب (باپ) کے بجائے رَبّ کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں، بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

اَب اور رَبّ، ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، اَب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے، اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں کچھ گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر یہ تعلق صد درجہ ناقص، محدود اور آنی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام وبقا، ضروریات زندگی، سامان حیات، نشو ونما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو کیا عبد ومعبود اور خالق ومخلوق کے درمیان جو ربط وتعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لئے بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے،

ربوبیت (پرورش) عبد اور معبود اور خالق ومخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے، جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے، انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت یا مشت استخواں، شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان اور ادھیڑ یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر وکرم اور لطف ومحبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یکسر پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں، جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی وابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حب الٰہی ہے، اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبان الٰہی نے شہادت دی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ۔ ۲) اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

اس نشۂ محبت پر باپ، مال، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان سب کو قربان اور نثار ہو جانا چاہیئے، ارشاد ہوتا ہے۔

اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ۔ ۳)

اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، ان کو پکار کر سنا دیا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (مائدہ۔ ۸)

مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا تو خدا (کو اس کی کچھ پرواہ نہیں وہ) ایسے لوگوں کو لاکر کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

حضرت مسیح نے کہا درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے، تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں، مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران۔ ۴) اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

محبت کیونکر حاصل ہو، وحی محمدی نے اس رتبۂ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتادی، فرمایا!

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم۔ ۶)

جو لوگ ایمان لاتے اور نیک کام کئے رحمت والا خدا ان کیلئے محبت پیدا کرے گا۔

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں، ایمان اور عملِ صالح یعنی نیک کام، چنانچہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (مائدہ و بقرہ ۔ ٢٤)	خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ (بقرہ ۔ ٢٨)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (آل عمران ۔ ١٧)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (مائدہ ٦ و حجرات ۔ ١)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ ۔ ١)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ (صف ۔ ١)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستے میں لڑتے ہیں۔
وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (آل عمران ۔ ١٥)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ (توبہ ۔ ١٣)	اور خدا پاک و صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے پیار کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا، محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں، اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں، اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لئے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لئے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں، اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔[1]

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر اس کی فکر کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے، تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے، پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں، جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہتے ہیں، لیکن جو محبوبِ حقیقی کے طلب گار اور اس کے دالہ و شیدا ہیں، ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہوگا۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (یونس ۔ ٧)	ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محبت کا وہ درجہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، در گذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے، اس کا نام رحم اور رحمت ہے، اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے، اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے، اس کا نام رحمان و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے، وہ نہیں تو کچھ نہیں، اس لئے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے، مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتا ہے، گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر ان کے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ	اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ تعالیٰ

[1] احمد بن حنبل مسند ابوذر جزء ٥ ص ١٧٦۔

يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (زمر-۶)

تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

فرشتے حضرت ابراہیم کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں،

فَلَا تَكُن مِّنَ الْقَانِطِينَ (حجر-۶)

تم نا امید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبہ خلعت محبت سے مافوق ہے، اس لئے جواب دیا،

وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ (حجر-۴)

اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون نا امید ہوتا ہے۔

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں منجملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے، خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے رحمان و رحیم بھی اور غفور و رؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام-۲)

اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

قاصد خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ، اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ہمارا باب رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (انعام ۶)

اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں، تو ان سے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بے شک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں،

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف-۱۹)

اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو از خود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی، جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا، اگر مومن کو یہ معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عذاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا، یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے، بارگاہ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹے جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہوں گا، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹے اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں، اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کر دوں، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ

ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا[1]۔ کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفوِ عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سُنی ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی وفات کا وقت جب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشتا[2]۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈھتے ہیں، مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں اور قرابتداروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رحم و محبت ہے، نیز جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے شاندار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ اس شاہ حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں[3]۔ اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں، اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے، صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہؓ نے تنگ آ کر کہا، خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی، فرمایا، اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے[4]، تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لئے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا، خدا کی معرفت سے بھی نا آشنا تھے کس طرح اس نے حقیقت کر دیا اور ان کو ذاتِ الٰہی کے ساتھ وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا، بلالؓ کو دیکھو ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر ان کو لٹایا جاتا ہے، ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کرنے پر ان کو مجبور کیا جاتا ہے، وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مگر زبان سے وہی احد احد ایک ایک کا ترانہ نکلتا ہے[5]۔ مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے، ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحن مکہ میں جوشِ وحدت پرستی سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا باواز بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف پتھروں اور ڈھیلوں کی بارش ہوتی ہے، بعض لوگ آ کر چھڑا دیتے ہیں، لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر محبت الٰہی کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے، اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے[6]۔

ایک صحابی جو رات کو میدانِ جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لئے متعین تھے، وہ اپنی نیند ٹالنے کے لئے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور نماز میں محو رہتے ہیں ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑ دی، کہتے ہیں کہ جو سورہ شروع کی تھی ابھی نہ چاہا کہ اس کو تمام کئے بغیر چھوڑ دوں[7]

---

[1] جامع ترمذی ابواب الدعوات، و دیگر کتب احادیث صحیح۔ [2] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۴۱۴ [3] بخاری کتاب الادب باب ص ۸۸۷ [4] بخاری کتاب الحدود باب یکرہ من لعن شارب الخمر ص ۱۰۰۲ [5] سیرت ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین و اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۰۶ مصر [6] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاریؓ [7] صحیح بخاری و سنن ابی داؤد کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم۔

ربیہ وسلم کے دو جانشین عین حالتِ نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں، مگر مقتدیوں کی صف اسی طرح باقی رہ سامنے کھڑی ہے، ہر ہر فانی و میت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے، اسی لئے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے یعنی رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی، قبر کھودی جانے لگی تو فرمایا، اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اس کے ساتھ کشادگی فرمائی ہے۔ اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا، ہاں، کیونکہ اس کو خدا اور رسول پیارے تھے۔[1] ایک دفعہ آپ نے ایک صاحب کو کسی مہم کا افسر بنا کر بھیجا، وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر سورۃ کے آخر میں قل ہو اللہ ضرور پڑھتے، جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمتِ اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا، فرمایا، ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ اس لئے کرتا ہوں۔ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے، فرمایا کہ ان کو بشارت دو کہ وہ رحم کرنے والا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔[2] یہ بشارت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمتِ والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی، فرمایا تم نے اس کیلئے کیا سامان کر رکھا ہے، انہوں نے نادم ہو کر شکستہ دل سے عرض کی یا رسول اللہ! میرے پاس دو گونہ نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا، جو کچھ سرمایہ ہے وہ صرف خدا اور رسول کی محبت ہے اور بس! فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا، اسی کے ساتھ رہے گا، صحابہؓ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔[3]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتۂ خاص جبریلؑ سے کہتا ہے کہ فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں، تم بھی اس کو پیار کرو، تو جبریلؑ بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسنِ قبول بخش جاتا ہے۔[4]

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنے عملوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔[5] یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانۂ محمدیؐ کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں، لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے، یہ وہ لوگ

---

[1] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی حفر القبر۔ [2] مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین و قصرہا، باب فضل قراءۃ قل ہو اللہ احد، یہ واقعہ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بین السورتین میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہ صلعم کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔ [3] مسلم کتاب الادب باب المرء مع من احب بخاری کتاب الادب باب ما جاء فی قول الرجل ویلک۔ [4] مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبداً حببہ لعبادہ۔ [5] بخاری کتاب الرقاق باب التواضع۔

ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں، تو یہ قابلِ رشک رتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا ہے۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔[1]

یہ محبتِ الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ پر نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اسی کی محبت کے سبب سے مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب سے میرے اہل بیت سے محبت کرو۔[2] یہ عشق و محبت کی دعوت محبوبِ ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب حبیب خدا ہے۔ دیکھو کہ حبیب اور محبوب میں خلوت و محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں، آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے، ہر کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے اور کیا طلب کرتے تھے، امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبتِ الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے لیکن محبوبِ خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے، خداوندا،

اسئلک حبک وحب من یحبک وحب عمل یقرب الی حبک (احمد، ترمذی، حاکم)	میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہو اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کر دے،
اللّٰھم اجعل حبک احب الی من نفسی واھلی ومن الماء البارد (ترمذی و حاکم)	الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے لیکن حضورؐ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی وہ صرف محبتِ الٰہی کا زلالِ خالص تھا، جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا، عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشقِ الٰہی مسیح کا قول ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا پھر وہ کون روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا، حضورؐ دعا فرماتے ہیں،

اللّٰھم ارزقنی حبک وحب من ینفعنی فی حبک (ترمذی)	خداوندا! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہو مجھے روزی کر۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے، مگر جانتے ہو کہ اس راہ میں آخری منزل کیا ہے؟ صحیحین میں ہے۔[3]

ما کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما	یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اس طرح

---

[1] اس کو امام مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں دیکھو مشکوٰۃ کتاب الادب فی حب اللہ فصل ثانی (صفحہ ۴۲۷)۔ [2] مشکوٰۃ باب مذکور۔ [3] مشکوٰۃ مناقب اہل بیت بروایت ترمذی۔ [3] مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بھن وجد حلاوۃ الایمان بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔

محبت کریں جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقہ تعبیر کو اس بناء پر کردہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے، اس لئے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے خالی ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ یہ دعویٰ سراپا بے بنیاد ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدی کی بلندی نظر اور محبت کا علوے معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں، ثبوت میں قرآن پاک کی یہ آیت پاک بھی پہلے پیش کی جا چکی ہے

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ - ۲۵)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔

لیکن احادیث سے ہمارا دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ پڑی ہے جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آرہا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے، جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہو گیا ہے، محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آجاتا ہے، اس کو اپنے بچہ کے جوشِ محبت میں چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دودھ پلا لیتی ہے؛ دفعۃً رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے، اور آپ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟ لوگ عرض کرتے ہیں ہرگز نہیں آپ فرماتے ہیں، تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے، خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔[1]

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے، یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا، ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے، تو بولی کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی، یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔[2]

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی ایک پرندہ کو مع اس کے بچوں کے چادر میں باندھ کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آکر بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا، کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔[3]

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگا لیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے، انھوں نے کہا، ہاں۔ فرمایا تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی تم کو اس بچہ سے ہے، وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔[4]

جمالِ حق کا پہلا مشتاق اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بندکشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے جان بخار سے تپ رہا ہے اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اطلاعِ خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جانثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعۃً لبِ مبارک ہلتے ہیں اور یہ آواز آتی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد [2] سنن نسائی باب ما یرجیٰ من الرحمۃ [3] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسماء باب رحمۃ و غضب [4] الادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص ۵۰، مصر۔

ہے، لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا، یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالتِ نزع میں زبان پر یہ کلمہ تھا، خداوند ارفیق۔

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گنہگار بندوں پر اس کی شانِ بخشش کا ترانہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابو ذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین نے یہ پیغام ربانی ہم کو سنایا۔

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے رستہ پوچھو، میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا لیکن جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو، میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا لیکن جس کو میں نے پلایا، تو مجھ سے پانی مانگو، میں تم کو پلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں ہے اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا، اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے گنہگاروں کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی، لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈبو کر نکال لی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے، وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔

بت کا یہ پرکیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبانِ مبارک سے سنا، تسلی و تشفی کا یہ روح افزا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، عفو و کرم کے بحرِ بیکراں کا یہ ساحلِ امید آپ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا اور گنہگاروں کو میرے بندو! کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلے سے میسر آئی، صلی اللہ علیہ وسلم۔

☆

۱؎ صحیح مسلم کتاب المساجد ۲؎ صحیح بخاری ذکر نبوی ۳؎ صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۶۰ و ص ۱۷۷ و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵ ہم
ہم نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیئے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں (دیکھو
متی ۲۵-۳۵ تا ۴۵) مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیئے۔

فرشتوں پر ایمان

وَمَلٰٓئِکَتِہٖ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے اس کا واحد مَلَک ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں، اسی لیے قرآن پاک میں ملائکہ کے لیے رُسُل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک، ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کا انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے اور چلا رہے ہیں، یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا، کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں، ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، گویا ان کی خلقت اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیاء پر اپنے جو احکام اتارتا یا ان سے کلام کرتا ہے وہ انہی کی وساطت سے کرتا ہے،

دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں، یونانی مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام عقول عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں کے اندر بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کیے گئے ہیں بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردہ کا پتہ لگتا ہے جن میں سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے جس سے مقصود وہ اولیں ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہل فلسفہ عقل اول سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام امشاسپند ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے یہودی ان کو ملائکہ کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھتے ہیں، عیسائی بھی ان کو انہی ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل اور روح القدس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں، جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں، جو صانع و مصنوعات اور خالق و مخلوقات کے درمیان اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں،

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی وہ کبھی مخلوق کہی جاتی

تھیں اور کبھی خدائی کے مرتبہ تک بھی بلند کر دی جاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی کیفیت تھی، پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا، کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی رہتی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خود خدا ان میں سے ایک ہو جاتا تھا، ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابلِ پرستش سمجھی جاتی تھیں ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشاسپند تھا اور ان کے تحت میں ۳۳، پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے اس لئے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے براہِ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں ہلاکتوں اور برائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے ان اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے تھے دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پرے لیکر باہم نبرد آزما رہتے تھے، یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا نر فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی، جو اس کی بیوی تھی، ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیویوں کا تصور تھا، مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، یہودیوں میں فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیس اور ثناء و صفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنیوالے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی، اس کے آگے جھکا جاتا تھا، اور اس کو خداوند کہہ کر اس طرح خطاب کیا جاتا تھا، کہ کہیں کہیں یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ (تکوین ۱۶، ۱۳ و ۱۸، ۲، ۳، ۲۲، ۷) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے (تکوین ۶، ۲) عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صابئیوں میں فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور انکو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے ان کی پرستش ہوتی تھی، اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے، یونانیوں میں عقل اول اور عقولِ عشرہ تمام عالم کے خالق کارفرما اور مرجع کل مانے گئے، اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آکر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنائے گئے انکی پرستش ناجائز کی گئی، نر و مادہ کی مادی جنسیت سے وہ پاک کیے گئے، اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد کو بیشمار اور درجہ بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا کام شب و روز صرف آقا کا حکم بجا لانا ہے، عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا، اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیئے گئے، قرآن میں انکی ہستی صرف اس قدر تسلیم کی گئی ہے کہ وہ صرف غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثنا اور اطاعت و فرمانبرداری ہے خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہی ہیں لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے اسی لیے قرآن پاک نے یہودیوں کی طرح ان کو خداوند کا خطاب

نہیں دیا، نہ پارسیوں کی طرح ان کو قابلِ پرستش کے لقب سے یاد کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا، اور دیوی کہا، بلکہ صرف ملک اور رسول کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغاز خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ ملائکہ کا مسجود بنے، چنانچہ اس کو مرتبہ علم میں ان سے بالاتر ٹھہرایا گیا اور خدا کی جس تسبیح اور تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا، اس کے باوجود جب انسان کا جوہر طبیعت انہوں نے پہچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ (بقرہ ۳:۴)

تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بیشک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے،

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرفِ مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے یکساں عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت بخشی گئی ہے کہ اپنے نفع و نقصان کے لیے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اور پوری مملکتِ الٰہی میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں،

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ رکھا ہے جو ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے لوگ انہی ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے کیونکہ وہ بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے، کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے، جو اس پر حکمراں ہے، یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھکتے ہیں، اسلام کے نظریۂ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العٰلمین اور فرمانروائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں اسی کے آگے جھکنا چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے،

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں، جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور وہ اسباب و علل جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر مؤثر جانتے اور جن کو بت پرست دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں ان کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور

نظریے ہیں جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے اس لیے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ خلافِ عقل ہے بلکہ جسطرح قیاسات اور عقلی نکتہ پروازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، ویسا ہی یہاں بھی کیا جا سکتا ہے، اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور انکے اسباب و علل کا مسئلہ عقلاء میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معما آج بھی اسی طرح لاینحل ہے جس طرح پہلے تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے، اس لیے اگر حکمائے ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت اربابِ مذہب نے نکالی ہے تو وہ محلِ اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ خلافِ عقل کہی جا سکتی ہے کائنات کے حوادث میں جسطرح مادی علل و اسباب کارفرما ہیں اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل و اسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں اور ان دونوں قسم کے اسباب کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام بخت و اتفاق رکھتا ہے حالانکہ مسئلہ علل و اسباب کو مان لینے کے بعد بخت و اتفاق کوئی چیز نہیں رہ جاتا، یہی روحانی علل و اسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے، جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکماء کے اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب و علل کے قوائے طبعی سے کرتے ہیں، اور ہم قوائے روحانی سے۔

اس تقریر کا یہ منشاء نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص و طبائع، اور اس مادہ کی ملکیت میں مقرر طبعی اصول و قوانین موجود نہیں ہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص و طبائع اور اصول و قوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو ان ہی اصول و طبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں،

سمجھنے کے لیے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال و حرکات اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء، بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ و ریشہ پر حکمران اور مسلط ہے باایں ہمہ وہ روح اصولِ مقررہ کے تحت ہی اعضاء سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی اسی طرح غیر ذی روح اشیاء میں ابر و باد سے لیکر دریا، پہاڑ، چاند اور سورج تک پر ارواح مقرر ہیں جو ان اشیاء سے خدا کے اصولِ مقررہ کے مطابق یہاں افعال و حرکات کا صدور کراتی ہیں۔ جسطرح ہماری روح اپنے اعضا اور اعضا کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ اشیاء کے مقررہ خواص طبائع کے سہارے پر کرتی ہے اسی طرح ملائکہ بھی انہی مقررہ خواص و طبائع کے ذریعہ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جسطرح ہمارے ارادی افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح و نفوس واسطہ ہیں، اسیطرح تمام عالم مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوسِ مجردہ واسطہ ہیں اور جس

طرح، ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا، پھر بھی یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالم کائنات کے جو نوعی افعال ہیں ان میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی، ہمرنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے؟ کیونکہ انسان نے ارادہ پاکر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعالِ اختیاری کی ذمہ داری باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعے ثواب اور عصیان کرکے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواحِ مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہوکر صرف اطاعت، فرمانبرداری، اور انقیاد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں عصیان، تمرد، سرکشی اور حکم الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال و حرکات اور خصائص میں یکسانی، ہمرنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے یہی حقیقت ہے جو فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورتوں میں ہمارے لیے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

اب ہم کو تعلیماتِ نبوی، یعنی آیات و احادیث سے ملائکہ کی حیثیت کو روشن کرنا چاہیے ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی، یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور اس کام میں ان کا بے اختیار ہونا، ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (الحج: ۱۰)

خدا ہی ہے، جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے بیشک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور وہ ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں ہے، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں، اور وہی تمام امور اور انتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (فاطر: ۱)

حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنیوالا ہے، اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کیلئے رحمت کھولے تو کوئی اسکا روکنے والا نہیں، اور جو روکے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں، اور وہی غالب دانا ہے۔

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، کہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنیوالا صرف خدا ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید کرتی ہے، کہ فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ ہے، یا وہ پرستش کے قابل ہیں یا ان کی دہائی بھی پکارنی چاہیے۔

۲۔ ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں:۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (انفال: ۲) — (یاد کر) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ مِّنْ کُلِّ اَمْرٍ (قدر: ۱) — اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لیکر نیچے اترتے ہیں،

وہ جس طرح احکام لیکر اترتے ہیں، اسی طرح دربارِ الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں،

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ اِلَیْہِ (معارج: ۱) — فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔

موت کے وقت روح کا قبض کرنا، انہی سے متعلق ہے،

قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ (سجدہ: ۱) — کہدو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے وہ تم پر موت طاری کرے گا۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ (انعام: ۱۱) — اور اگر دیکھو تم جب گنہگار موت کے سکرات میں ہوں، اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو،

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَۃُ (انفال: ۷) — اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔

اسی کے ہم معنی اور بھی کئی آیتیں ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ حکمِ الٰہی کے مطابق موت و فنا کی تمام علل و اسباب کی انہی روحانی قوتوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لیے کسی ایک علت و سبب کا وجود کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل و اسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل و اسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے جو بحکم الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے[1] اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے،

وہ کام کی تدبیر کرتا ہے، اور کبھی ملائکہ کی طرف،

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ (نازعات: ۱) — ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم (رگوں کی گرہوں کے کھولنے والوں کی قسم ہے (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی پھر دوڑ کر (مادی اسباب و علل پر سے) آگے بڑھ جانے والوں کی پھر کام کی تدبیر کرنیوالوں کی قسم ہے۔

یہی ملائکہ خدا اور رسول کے درمیان بھی سفیر ہیں:۔

[1] صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ (شوریٰ: ۵)

یا خدا آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ اپنا ایک سفیر بھیجتا ہے وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے،

دوسری جگہ ہے:-

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ (نحل: ۱)

خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے،

خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے:-

فَاِنَّہٗ نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (بقرہ: ۱۲)

بس اس (جبریل فرشتہ) نے (قرآن) کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا،

۴- یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لیکر بھی اترتے ہیں:

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی

ہمارے سفیر ابراہیم کے پاس بشارت لیکر اترے،

اسی طرح حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی،

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا (مریم: ۲)

میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔

حضرت لوطؑ کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لیے آئے اور

قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ (ھود: ۷)

کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم پر کوہِ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں، اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے، کیونکہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا،

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَھَا سَافِلَھَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ (ھود: ۷)

تو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی۔

۵- فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں، اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۝ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ۝ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (انفطار: ۱)

بیشک تم پر نگہبان ہیں جو بزرگ ہیں لکھنے والے ہیں، جو تم کچھ کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں۔

مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ۝ (ق: ۲) کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا، لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے،

سَوَآءٌ مِّنْکُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَھَرَ بِہٖ وَمَنْ ھُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّھَارِ

تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے خدا کے تعاقب کرنیوالے اس کے

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ (رعد: ۲)

سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اسکی نگرانی کرتے ہیں۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝ (انعام: ۸)

اور وہ (خدا) تم پر نگراں بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے۔

۶۔ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں:

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (انبیاء: ۷)

نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا،

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ (فصلت: ۴)

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اس دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (احزاب: ۶)

وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے،

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب: ۷)

اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں،

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ (شوریٰ: ۱)

اور جو زمین میں ہیں انکے لیے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں،

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ (آل عمران: ۹)

ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ (بقرہ: ۱۹)

جو کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

۷۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا،

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ؕ (زمر: ۸)

اور کفر کرنیوالے گروہ در گروہ کرکے دوزخ کی طرف لے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اسکے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہیں میں کے پیغمبر نہیں آئے۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت

حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (زمر: ۸)

میں لیجائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اسکے پاسبان کہیں گے تم پر سلامتی خوش خوش جنت میں ہمیشہ کیلئے داخل ہو جاؤ،

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد: ۳)

اور ان جنتیوں پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا بدلہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے،

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (تحریم: ۱)

اس (دوزخ) پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں،

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (مدثر: ۱)

اور ہم نے دوزخ کا اہلکار فرشتوں ہی کو بنایا ہے،

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کے حاضر باش ہیں،

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (زمر: ۸)

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے ارد گرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد وثنا میں معروف ہوں گے،

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى (صفٰت)

اعلی اہلِ دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے،

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۢ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (ص: ۵)

مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔

قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیے تیار رہیں گے،

وَالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝ (حاقہ: ۱)

اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے ہونگے،

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۝ (نبأ: ۲)

ہرگز نہیں جب زمین ریزہ ریزہ کردی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا، اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے (دوسری جگہ) جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔

۹ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد وثنا میں معروف رہتے ہیں، اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں، اور اس کے حضور میں اہل زمین کے لیے عموماً اور نیکوکاروں کے لیے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں،

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (شوریٰ: ۱)

اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشائش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کر بخشنے والا اور رحم کرنیوالا خدا ہی ہے۔

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ فرشتوں کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دستِ اختیار میں ہے،

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مومن : ۱)

جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانیوالوں کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ۝ (انبیاء : ۲)

آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں، یعنی فرشتے وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے، اور نہ اسکی عبادت سے تھکتے ہیں وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، سست نہیں پڑتے۔

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ۝ وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ (انبیاء : ۲)

بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں، جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے، اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝ (تحریم : ۱)

خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔

وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ (رعد : ۲)

اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں،

وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝ (نحل : ۶)

اور آسمان میں اور زمین میں جو چار پائے اور فرشتے ہیں، وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں، اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے وہ اپنے مالک جو انکے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انکو حکم دیا جاتا ہے۔

گذر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفہ کے رو سے عقلِ اول کی اضطراری پیدائش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا، اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابئی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے، اور انہیں کو عالم کا فرمانروا مانتے تھے، یہودی بھی ان کو کسی قدر صاحبِ اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے، جیسا کہ توراۃ (صحیفۂ تکوین ۱۶-۱۳ و ۱۸، ۲ و ۳، ۲۲) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ خدا کے بیٹوں کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے (تکوین ۶، ۲) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے، اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے، اور تثلیث کا ایک رکن تھا، عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے وہ ان کی پوجا کرتے اور انکو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے۔

تعلیم محمدی نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا، اور ایک ایک کرکے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی، اور بتایا کہ

فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت، عبادت اور اسی کے احکام کی بجاآوری میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں، نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں، اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے دونوں کی تردید کی، اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، وہ نہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (انبیاء: ۲)

مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے اس سے پاک ہے بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اسی کی جس کے لیے خدا پسند کرتا ہے، اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور ان سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اسکو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ (نساء: ۲۳، ۲۴)

خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اور خدا کا وکیل ہونا کافی ہے۔ مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے، اور نہ مقرب فرشتوں کو (اس سے عار ہے) اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو وہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۸)

خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝ (سبا: ۵)

اور جس دن وہ سب کو جمع کریگا پھر فرشتوں سے کہیگا کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے تھے وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا والی ہے وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے وہ اکثر انہی جنوں پر ایمان لائے ہیں۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ (نبا ۲)

جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے تو کچھ بول نہ سکیں گے لیکن وہ جس کو مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَّأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝ (نجم ۳)

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو چاہے اجازت دے اور پسند کرے۔

أَفَأَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوا ۚ وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ۝ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ (اسرائیل ۴۰:۵)

کیا تمہارے لیے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لیے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کو باتیں بیان کی ہیں لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتا ہے کہہ دو اے پیغمبر اگر اس ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کر لیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے، ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ۝ وَقَالُوا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۗ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝ (زخرف ۲)

اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے ہم انکی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی بازپرس کی جائے گی اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان (فرشتوں) کو نہ پوجتے انہیں اس کا (تحقیقی) علم نہیں وہ صرف اٹکل لگاتے ہیں۔

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں،

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا اور انہوں نے کھایا، (تکوین ۱۸: ۸) لیکن قرآن پاک نے اس قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی ہے کہ فرشتے انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا مگر

فَلَمَّا رَآٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۚ قَالُوا لَا تَخَفْ

جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو ان کو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا انہوں نے کہا ڈرو نہیں،

إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ۝ (ھود: ۷) ہم لوط کی قوم کی طرف ان کے تباہ کرنے کیلئے بھیجے گئے ہیں

کفارِ قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا اسکے جواب میں کہا گیا:

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝ (انعام: ۱) اور اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو دا آدمیوں کے لیے اسکو آدمی ہی بناتے اور جس شبہ میں اب ہم نے انکو ڈالا ہے اسی میں پھر بھی پڑے رہتے یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں بلکہ آدمی ہو

اس آیت اور دوسری آیتوں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے تاہم فرشتے کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت مریمؑ وغیرہ کے قصوں میں ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ (مریم: ۲) وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتوں کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لیے دعوت کا سامان کیا مگر یہ دھوکا جلد رفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے جب تک اس کی تصریح نہ ہوتی، کلمہ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی،

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جو ان مادی خواص و طبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے، کیونکہ یہی پتھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لیجاتا ہے، اور حقیقت ان مادی خواص و طبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظام عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات موثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ سے اون کو موثر بناتا ہے اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواحِ مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

وحدتِ سلسلہ

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایتِ ربانی کے لیے وہی منتخب کی گئی ہے، اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محرو م ہیں اور رہیں گی اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بابل و نینوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ ہونے کا دعویٰ تھا، اور وہ صرف اپنے کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونیکا مستحق جانتے تھے، لیکن تعلیم محمدیؐ نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا، آپؐ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں، نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے، ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں خدا کی مخلوق ہیں آپؐ نے فرمایا لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدمؑ) کی اولاد ہو، اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا، اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ و نسب ملک و مرز بوم اور زبان سے نہیں، بلکہ صرف تقویٰ اور نیکو کاری سے ہے[1]

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہوگیا۔ بنی اسرائیل جن کو خدا کا کنبہ ہونے کا ناز تھا، نبی محمدیؐ نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (مائدہ: ۳) بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف انہی کے خاندان کا ورثہ ہے جسطرح اس آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور نبیوں نے سنی جو وید کے اوراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی اپنی جگہ پہ یہی خیال تھا اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف و عدل و کرم اور رحمتِ عام کے منافی قرار دیا، اور کہہ دیا:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (جمعہ: ۱) یہ (نبوت) اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ کہدو کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے (اسرائیلی علماء اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جیسا دین تم کو دیا گیا کسی اور کو دیا جائے

[1] مسند احمد بن حنبل، ابو نضرۃ تابعی۔ جامع ترمذی آخر کتاب المناقب۔ قرآن اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔

الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ، يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ، (آل عمران : ۸)

یا یہ کہ دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہدو کہ دینِ نبوت کا فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسکو چاہتا ہے اسکو دیتا ہے اور اللہ کی رحمت سب کو عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو بھی خوب جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کیساتھ مخصوص کرتا ہے، وہ بڑا فضل والا ہے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (بقرہ : ۱۳)

اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کیطرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک برابر جاری رہا۔

بعثت محمدیؐ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی، ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا، زردشت نے پاک نژادانِ ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوۂ نورانی سے محروم یقین کیا تھا، بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے، عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں، اس کی نگاہ میں عرب و عجم، شام و ہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب پچھم اتر دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا، اور ہر زبان میں اس کی آواز سُنی۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس : ۵) — اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (نحل : ۵) — اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ (روم : ۵) — اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول انکی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔

وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد : ۱) — اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما آیا۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر : ۳) — اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنیوالا نہ آیا ہو۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ (زخرف) وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم : ۱) — اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا، تاکہ وہ ان کو بتا سکے۔

اس آخری آیت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی یہ تعلیم الٰہی تشریح و بیان کے لیے مامور ہے۔ ایک یہودی کے لیے حضرت موسیٰؑ کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں

کا انکار کرکے بھی عیسائی رہ سکتا ہے، ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زردشتی تمام عالم کو بجز ظلمات کہکر بھی نورانی ہو سکتا ہے، اور وہ ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دینداری کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی انکی پیروی کا دعویٰ کرکے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا وَالنَّبِيُّونَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ، "سب نبی برحق ہیں اور محمد بھی برحق ہے، غرض کوئی شخص اسوقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک پہلے موسوی، عیسوی اور سلیمانی و داؤدی نہ بن لے اور کوئی شخص اسوقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جبتک دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راستبازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کیطرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا۔ (نساء ۲۱)

بیشک جو لوگ اللہ اور اسکے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اسکے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں وہی تو حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کیلئے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے، اور جو اللہ پر اور اسکے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی مزدوری خدا ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔

وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ (بقرہ: ۲۲)

اور فرشتوں پر، کتاب پر، اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے

وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا (نساء: ۲۰)

اور جنے خدا کا اور اسکے فرشتوں کا، اسکی کتابوں کا، اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

بقرہ کے خاتمہ میں ہے:

كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ، (بقرہ: ۴۰)

ہر ایک خدا پر اور اسکے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ (بقرہ، ۱۶، وآل عمران ۹)

ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ انہیں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اسلام نے اسکی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول صادق اور راستباز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے، اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے، اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے، یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے، وہ مسیحیت سے زیادہ ہے، اسلئے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں، مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا، اور جب تک

حصہ بخاری باب التہجد۔

کسی یہودی سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اسکو اپنے دائرہ میں داخل ہونیکی اجازت نہیں دی، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے یہود آپ کی رسالت، اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے، اگر حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا، مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے ان کا محروم رہنا قبول نہ فرمایا، اور ان سے صاف کہا:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَنْقِمُونَ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ (مائده: ۹)

اے یہود، کیا برا ہے تم کو ہم سے، مگر یہی کہ ہم خدا پر اور جو ہماری طرف اتارا گیا، اور جو پہلے اتارا گیا، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور تم میں اکثر بے حکم ہیں۔

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے نام سے چڑھتے تھے، تاہم ان کی خاطر سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت تقدس اور معصومیت کا انکار نہیں کیا گیا۔ قرآن نے کہا:

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (زخرف: ۶)

اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تو تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ، یہ لوگ جو وہ تجھ پر دھرتے ہیں، صرف جھگڑنے کو، بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ بن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے، خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں پر بھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرستی کا الزام دھرتے تھے، قرآن نے انکے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے، دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے، قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف انہی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے، یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے، قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ، بعض ایسے بھی ہیں جنکو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے، لیکن پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے، مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ، وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا، اور انکی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف بھی اشارہ کردینا مناسب ہے، اسلام سے پہلے نبوت، رسالت، اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی، یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کے تھے، اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے، اور جس کے متعلق وہ یقین رکھتے تھے، کہ اسکی دعا یا بد دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے، اسی لیے حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے، حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حیثیت ان کے

لہ تفسیر ابن جریر طبری جلد ہشتم ص ۱۶۷، مصر، ٢ دیکھو توراۃ صحیفہ تکوین باب ۲۰، ۷، ۳ تکوین ۱۴-۱۸۰

ہاں صرف بادشاہ کی ہے، اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنیوالے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت بے تامل منسوب کی گئی ہیں، عیسائیوں کے ہاں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے، ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ مجھ سے پہلے جو آئے، وہ چور اور ڈاکو تھے، موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ ان کے تذکرے ہیں، نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے، حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں، وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ انکے ہاں مسلم نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی، اسکے فرائض بتائے اس کی خصوصیات کا اظہار کیا، اور ان سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپؐ نے بتایا کہ نبوت ورسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے، جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ انکو دکھائیں، وہ ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنیوالے) داعی (خدا کی طرف سے بُلانے والے) مبشر (خوشخبری سنانے والے) معلم (سکھانیوالے) مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے، خدا ان سے ہمکلام ہوتا تھا، اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا، اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے، اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے، ان کے سب کام خدا کے لیے تھا اور خدا ان کے لیے تھا، یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے ہر قوم میں پیدا ہوئیں، جنہوں نے ان کو مانا، نجات پائی، اور جنہوں نے جھٹلایا، ہلاک و برباد ہوئے، قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی روداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خداپرستی کا اخلاص اسطرح بیان کیا ہے کہ انکے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، ان کے اتباع کا شوق، اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، اور ساتھ ہی اسنے شانِ نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں انکی طرف منسوب تھیں، ان کو چھوڑ دیا ہے، اور یا ان کی تردید کر دی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں، بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اسلیے انہوں نے نہایت بیباکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیئے، عیسائی ایک حضرت عیسیٰؑ کو تو معصوم کہتے ہیں، باقی سب کی گنہگاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اسکے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے، کیونکہ گنہگار گنہگاروں کی رہنمائی کا مستحق نہیں، اور اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا، اس بنا پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی وتعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت وجلالت دنیا میں قائم کی اور جن کو رباطنوں نے انکی عصمت وبیگناہی کے دامن پر اپنے وہم ونادانی سے داغ لگائے تھے، انکو دھو کر پاک صاف کیا، اور یہ رسالتِ محمدیؐ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے، قرآن

؎ انجیل ؛

نے اس کی تردید کی، اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہلوایا:

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا (مریم: ۲) — اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنیوالا، اور مجھ کو خدا نے جبار اور بد بخت نہیں بنایا۔

کیونکہ احکامِ عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بد بختی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروا نہیں کرتے تھے، قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا:

وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (مریم: ۲) — اور خدا نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں جیتا رہوں

یہود حضرت مریمؑ پر تہمت رکھتے تھے، قرآن نے اس الزام کو دور کیا، اور کہا:

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ (تحریم: ۲) — اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔

یہود حضرت سلیمانؑ کو گندہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے، حالانکہ سحر و جادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا۔ قرآن نے علانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (بقرہ: ۱۲) — اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا، بلکہ شیطانوں نے کیا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔

اسی طرح حضرت لوطؑ پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں اس کی تردید کی۔

اوپر گذر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لے لینے سے دلوں میں جوشِ عقیدت نہیں پیدا ہو سکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی، اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیاء کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیاء کا نام و نشان صحیفۂ محمدیؐ میں تلاش کریں گی، اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیاء کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی۔ فرمایا:

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ — ہم نے (اے محمدؐ) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی اور ہم نے ابراہیم کو اور اسمٰعیل کو اور اسحاق کو اور یعقوب کو اور ان کے نواسوں کو اور عیسیٰ کو اور ایوب اور یونس کو اور ہارون کو اور سلیمان کو وحی بھیجی اور داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا، اور خدا نے

تَکْلِیْمًا، رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا۔ (نساء: ۲۳)

موسیٰ سے بات کی، اور ان رسولوں کو خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب و دانا ہے۔

انبیاء کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن: ۸)

اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے انہیں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔

تعلیم محمدیؐ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کے انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں، اور اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو جن کی طرف منسوب کرتی ہیں انکی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بناء پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن اور رامؑ کو بلکہ ایران کے زردشت کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے، بہرحال امکان میں تو کوئی شک ہی نہیں، لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیا کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیے ہیں، اس لیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاء کے نام مذکور ہیں، تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں، ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیمبر آئے تھے، گو بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم ہیں، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں، اگر ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہیں، تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینۂ غالب ہو سکتا ہے، لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے، اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے۔

اس قسم کے انبیاء کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے گذر چکے ہیں اور ان کے پیروان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ (نحل: ۵)

اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو، اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء: ۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں، مجھی کو پوجو۔

لہ کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جان جاناںؒ سلہ ملل و نحل ابن حزم۔

اس لیے وہ تمام قدیم رہبرانِ انسانی اور رہنمایانِ عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے اور جن کی تبلیغ وتعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور جن کی زندگی اس تعلیم کے شایانِ شان تھی، انکی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کے مطابق انبیاء اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں، اسی بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کیساتھ تسلیم کرے، ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے۔ البتہ ان انبیاء میں ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ: ۳۳)

ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو نشانیاں دیں اور پاکی کی روح سے اس کی تائید کی۔

آپ نے دوسرے انبیاء کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی ہے کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو یَا خَیْرُ الْبَرِیَّہ اے بہترین خلق کہہ کر خطاب کیا، فرمایا وہ تو ابراہیم تھے[۱]، ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے عالی خاندان کون تھا؟ فرمایا یوسف[۲] پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ کو بشر پر فضیلت دی، ایک مسلمان یہ کھڑے سن رہے تھے، ان کو غصہ آ گیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو، اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا۔ اس نے دربارِ نبوی میں جا کر شکایت کی، آپ نے ان صحابی کو بلا بھیجا، اور مقدمہ کی روداد سنی، پھر نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ[۳] دو، یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو۔

یہی وہ تعلیمات محمدیؐ ہیں، جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب، روحانی مساوات، انسانی اخوت اور تمام انبیاء اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ان کی عظمت و جلالت اور ادب و احترام کرنیوالے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے۔ وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ نے آ کر دفعۃً اس کو مٹا دیا، اور انکی پاکی کی گواہی دی جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں، ہندوستان، ایران، چین جن کے سچے رہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب و احترام نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے، ان کے جائز ادب و احترام

[۱] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۵۲ [۲] صحیح بخاری کتاب الانبیاء و مناقب حضرت یوسف علیہ السلام ص ۴۷۹، [۳] (بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

کو اپنے ساتھ لیتے گئے،

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت و رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیاء اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے، جو ان کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ بن مریم پر تحقیر آمیز ہنسی آتی تھی[1]، اور جو حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے[2] محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہو گئے اور تبرکاً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے، اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں شائع اور ذائع ہیں، انہوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی، ان کے ادب و احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، ان کی تعظیم و تکریم کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنا لیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نام ادب سے لیے جائیں، مگر ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود و سلام پڑھے۔

کتب الٰہی پر ایمان

وَ کُتُبِہٖ

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے، ہر چند یہ عقیدہ گزشتہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا، اس کی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے، تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی، تاکہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے، سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا:

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (بقرہ: ۱) اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمدؐ) اتری گئی۔

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود، ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے اور اس لیے یہاں یہ آیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آجاتی ہیں، قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے انکو تسلیم ہی نہیں کرتا تو انکی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟ اسی بناء پر اس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ "ما جئت بہ" جو کچھ میں لیکر آیا اس پر ایمان لاؤ، قرآن نے کہا:

(بقیہ حاشیہ) [1] قرآن پاک سورۂ زخرف، رکوع ۶، [2] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ ص ۴۸۴ (حاشیہ صفحہ ہذا) [3] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ۔

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (محمد : ۱) — اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحب مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے، اور یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اہل قرآن قرآن کیساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اسوقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک صحیفۂ محمدیؐ کیساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی منجانب اللہ تسلیم نہ کرے چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع اولیٰ مذکورہ بالا آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (بقرہ : ۱) — اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ سے پہلے اترا۔

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ (بقرہ : ۴۰) — رسول ایمان لایا، اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا، اور اہلِ ایمان بھی ہر ایک خدا پر اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیاء کا اجمالی ذکر کر کے انکی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (بقرہ : ۱۶) — (اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندانِ یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ہم ان سب پر ایمان لائے۔

آلِ عمران میں کسی قدر تفصیل ہے:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (آلِ عمران ۹۰) — کہہ کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندانِ یعقوب پر اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اس پر اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا اس پر، ہم ان سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ — اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جسنے خدا کا اور اسکے فرشتوں کا اور اس

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ ...... فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (نساء: ۲۰)	کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

سورۂ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی بڑی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی تکذیب کریں:

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ (مومن: ۸)	جن لوگوں نے کتاب کو، اور جو پیغام دیکر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، اسکو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے، جب انکی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ گھسیٹے جائیں گے۔

نام کی تخصیص کیساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے، توراۃ جس کو ایک جگہ صحفِ موسیٰ بھی کہا گیا ہے (اعلیٰ: ۱) اور حضرت داؤد کی زبور اور حضرت عیسیٰ کی انجیل اور خود قرآن، انکے علاوہ ایک موقع پر صحفِ ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے:

اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (اعلیٰ) یہ باتیں گذشتہ صحیفوں میں بھی ہیں، ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں،

ان کے ماسوا اجمال کیساتھ دو موقعوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں:

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (طٰہٰ: ۸)	کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اسکی گواہی ان کو نہیں پہنچی!
وَاِنَّهٗ لَفِىْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (شعراء: ۱۱)	اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اسی بنا پر انبیاءؑ کی طرح ان کتابوں پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی و اجمالی ایمان ہے، جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان پر ناموں کے ساتھ، اور جن کے نام مذکور نہیں، ان پر بالاجمال ایمان ضروری ہے کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جسکا وجود قرآن سے پہلے ہے، لیکن اسکا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے، اور اسمیں توحیدِ الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہے تو اگرچہ ہم اسکو بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے، اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب[1]، یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے، لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونیکا شبہہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن پر ایمان لانیوالا مجبور ہے، کہ صحیفۂ ابراہیم، توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے، اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں، تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتبِ الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی معظم بالشان تعلیمات میں سے ہے جسکا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہیں، رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو جنت کا استحقاق پیدا کر سکتا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و حدیث الافک و تفسیر سورۂ بقر:

ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی تمام آسمانی کتابوں کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ تسلیم نہ کریں، جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں۔ یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے، عیسائیوں میں، مذہبی حیثیت سے مسیحی یہود اور بت پرست گو تین قومیں مانی جاتی ہیں مگر چونکہ انکے مذہب میں قانون نہیں ہے، اسلیے وہ اکثر امور میں رومن لا کے پیرو رہے ہیں، لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں، رومی اور غیر رومی، ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لیے اور غیر رومی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے، پارسیوں میں نژادان ایران اور بیرونی لوگ دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں، ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گذشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار طبقوں میں تقسیم فرمایا، اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیے جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا، یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مسلمان، جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الٰہی یقین کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر بھلائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

۲۔ اہلِ کتاب، یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جنکا نام قرآن میں مذکور ہے، کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں، وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کے حدود میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں، ان کو اپنے مذہب پر مجبور نہیں کیا جاتا، انکی جان و مال اور عزت و آبرو کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں، ان کا جائز کھانا وہ کھا سکتے ہیں، اور وہ اپنا کھانا انکو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہل الکتاب، یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ و انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود انکے علاوہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کے دعوی کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعوی کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا، مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ اہلِ کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عطا کیے ہیں، وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں، انکی جان و مال و آبرو اور انکے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

۴۔ کفار و مشرکین، یعنی وہ لوگ جنکے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں

انکو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے، لیکن حقوق حاصل کرنے کیلئے ان سے کہا جائیگا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کرلیں، جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں حرانی فرقوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کرکے اپنے لیے حقوق حاصل کیے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کی باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کیلئے آمادہ کیا، اور مجوسیوں، صابیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان تمام رسولوں اور انکے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم سے لیکر محمد علیہما السلام تک جتنے سچے مذاہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے، چنانچہ درحقیقت آپ کی یہی تعلیم تھی، اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے، جو آدم سے محمد علیہما السلام تک باری باری پیغمبروں کے ذریعے آتا رہا اور انسانوں کو اسکی تعلیم دیجاتی رہی۔

صحیفۂ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں، ایک دین اور دوسرا شرعہ، منسک اور منہاج، شرعہ اور منہاج کے معنی راستے کے ہیں، اور منسک کے معنی طریقِ عبادت کے ہیں، دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دین الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا، ایک رہا اور ایک رہیگا، نورِ معرفت ایک ہے، خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لیکر اول سے آخر تک تمام انبیاء آتے رہے اسمیں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا اور قوم و ملک کے اختلاف سے اسمیں کوئی اختلاف پیدا ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا، اور وہاں کے ہر پیغمبر نے اسکی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید، اسکے صفاتِ کاملہ، انبیاء اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوقِ انسانی، اخلاقِ فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی بازپرس اور جزا و سزا، یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں، جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے، اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے، تو طریقۂ تعبیر کی غلطی ہے اور یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی نقص شامل ہو گیا ہے۔

دوسری چیز جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان نے شرعہ، منہاج اور منسک کہا ہے، وہ جزئیاتِ احکام اور متفقہ مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں، مثلاً عبادتِ الٰہی ہر مذہب کا جزو لازم ہے، لیکن طریقِ عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کے لیے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرر کی ہے، مگر وہ سمت خاص خاص مصلحتوں کے لحاظ سے مختلف مقرر کی ہے، اسی طرح اعمالِ قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے، مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے، تو بدلتے رہے، مگر اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے، ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اس ازلی ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا

کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصلی مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسب حال ہوں وہ انکو بتائیں اور سکھائیں،

انبیاءؑ کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جبکہ اگلا صحیفۂ وحی جو دین و شریعت کا محافظ تھا، کھو گیا، یا انسانی دستبرد ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہوگئی، صحیفۂ ابراہیم کے گم ہوجانے کے بعد جسکا نہایت ناقص خلاصہ تورات کے سفر تکوین میں ہے، صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا، صحیفۂ موسیٰ کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کیلئے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، پھر انجیل آئی، اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لیے آیا ہے، اسلیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے، اور قیامت تک کی جائے گی اسلیے اسکے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اسکے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کے لیے آئمہ، خلفاء، مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنتِ نبویؐ کا احیاء اور بدعات کا قلع و قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے، اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحیِ محمدیؐ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

وحدتِ دین کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:-

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ

اُس نے دین میں تمہارے لیے وہی راہ مقرر کی جو نوح کو کہی تھی اور ہم نے تیرے پاس جو حکم بھیجا اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ سے یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے، وہ ان پر گراں گذرتا ہے، اور خدا اپنی طرف جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے، جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے لوگوں نے وحی کا علم حقیقی ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقتِ مقررہ تک کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو وہ کشفِ حقیقت کرکے، انکے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی، وہ اس امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتا، سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر

لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمُؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡؕ لَا حُجَّةَ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُؕ اَللّٰهُ يَجۡمَعُ بَيۡنَنَاۚ وَاِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُؕ (شوریٰ : ۲)

اور کہہ کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں، تم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ سب کو اکٹھا کریگا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوحؑ کو، ابراہیمؑ کو، موسیٰؑ کو اور تم کو اے محمد (صلوات اللہ علیہم) عطا کیا گیا ہے، اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذہنی تحریفات اور ذہنی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے فرقہ داری کی الگ الگ راہیں نکالیں پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدتِ دین کی حقیقت کا یقین اہلِ کتاب کو نہیں ہے، حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ ﷺ تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کیساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم ہو اور یہ اعلان کردو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اہلِ کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہیں تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں، یا معاملات میں تمہارے ساتھ عدل و انصاف کروں، پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے، دو نہیں، اگر اتحاد چاہو تو اس نقطہ پر ہم تم متحد ہوسکتے ہیں، البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے، اس کے ذمہ دار ہم تم خود ہیں، نہ تم ہمارے کاموں کے جوابدہ ہو اور نہ ہم تمہارے کاموں کے، اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں،

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے۔

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ (آل عمران : ۷)

اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے، متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں اگر وہ اسکو قبول نہ کریں تو کہدے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکم الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں۔

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ داریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کردی تھیں، ان کی طرف اشارہ کرکے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهُمۡ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ (انعام : ۲۰)

بیشک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہوگئے تجھ کو ان سے کوئی واسطہ نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، وہ ان کو جتا دیگا جو وہ کرتے تھے۔

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل "دین قیم" کی جو ابراہیمؑ کا تھا، دعوت دی گئی :

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﳛ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (انعام: ۲۰)

کہدے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف میری رہنمائی کی، جو دین صحیح ہے ابراہیم حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھے۔

غرض اسلام وہ دین قیم ہے جو ہمیشہ انبیاء کا دین رہا، اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحد دین کی پکار ہے جس کی طرف تمام انبیاء اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے، اسی لیے اکثر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (انعام: ۱۰)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، سو تو انہی کی راہ پہ چل۔

بعض اسلامی حدود و شرائع کی تشریح کے بعد فرمایا گیا:۔

یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ وَ یَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (نساء: ۵)

خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھلائے جو تم سے پہلے تھے۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے، اور یہ امر واقعہ ہے، جو لوگ قرآن کا اس لیے انکار کرتے ہیں کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے، ان سے کہا گیا:

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى (اعلیٰ: ۱)

بے شبہ یہ بات، اگلے صحیفوں میں تھی یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ایک اور آیت میں کہا گیا:

وَ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (شعراء: ۷)

اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا:

مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ (حٰم السجدہ: ۵)

(اے محمد) تجھ سے (اس کتاب) میں وہی کہا گیا ہے، جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے، بلکہ یہ اسی پرانی دعوت کی تکرار ہے جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یا دب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گذشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا، اور ایک ہی حقیقت تھی، جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمال بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت

تک محفوظ و باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے، اور جو اصل مقصد نہیں، ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہی ہے اور عہدِ محمدیؐ تک برابر بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے، یہودیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض تھا کہ آپ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں، قرآن نے اس کے جواب میں یہی ہمیشہ کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے، اور ہوتا رہے گا، اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے، اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے، بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی، وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے ہی وابستگی اور لگاؤ تھا، اسلیے یہ ان کا قبلہ بنی، چنانچہ قرآن نے تعیینِ قبلہ کے موقع پر کہا:

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ ۱۸)	اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے، جدھر وہ منہ کرتا ہے، سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو، بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو، اس لیے فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ (بقرہ ۲۲:)	نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رُخ کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)

اسی طرح خانۂ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر گروہ نے اپنے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کیلئے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے اور اسلام نے خانۂ کعبہ کے حج کو اسلیے تجویز کیا ہے۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ (حج:۹)	ہر قوم کے لیے ہم نے عبادت کا طریقہ بنایا، جس کی اس قوم کے لوگ مذہبًا پابندی کرتے ہیں، سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا تو بیشک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہے، اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہدے کہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

سورۂ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا، یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں جنکو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔

پہلے یہودیوں سے کہا:

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ (مائدہ ۷:)	ہم نے توراۃ اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی پیغمبر، جو حکمبردار تھے وہ یہود کا فیصلہ کرتے اور ان کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے، اور وہ تھے اس پر خبردار۔

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ط

اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو بتاتا ہوا اس کو جو اس کے پہلے تھے، یعنی تورات اور ہم نے اس کو انجیل دی اسمیں ہدایت اور روشنی ہے) اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی توراۃ کی اور ہدایت اور نصیحت پرہیزگاروں کے لیے، اور چاہیے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں خدا نے اتارا،

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ، (مائدہ:۷)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے، سو تو ان کے درمیان اسکے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے، اسکو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر،

دیکھو کس خوبی کیساتھ صحیفۂ محمدیؐ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی اور ان اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے، اپنی اپنی کتب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گذشتہ کتابوں کا امین و محافظ بن کر آیا ہے اور اسمیں ان سب کتابوں کی سچائیاں یکجا ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہواء (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی، یہ اہواء کیا ہیں، کتاب الٰہی میں تحریف و تصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ "افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے (بقرہ:۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر ان اہل کتاب کی اہواء کی پیروی نہ کریں اس کے بعد حدود و جزاو سزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات، انجیل، اور قرآن میں بلحاظ مراسم بتایا گیا، فرمایا:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ط (مائدہ:۷)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔

انہی اختلافات کی بناء پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (بقرہ:۱۴)

اور یہود نے کہا نصاریٰ کسی راہ پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہود کسی راہ پر نہیں، حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے:

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا (بقرہ:۱۶)

اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ۔

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا ط وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ج (بقرہ : ۱۶)

کہہ بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو موحد تھا مشرک نہ تھا تم لوگ کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا اور سب پر ایمان لائے، ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے، اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح لائیں جسطرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔

یہود اور نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:-

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (بقرہ : ۱۳)

یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

جواب دیا گیا:-

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (بقرہ : ۱۳)

یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔

بلکہ:- بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ : ۱۳)

ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کرکے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ : ۸)

بیشک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان)، جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ان پر خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دور نبوت میں خدا کی توحید پر روز آخر کی صداقت پر ایمان لایا، اور اچھے عمل کیے، انکو اپنے کام کا پورا ثواب ملیگا، یعنی جسنے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر اور بت پرستی سے یقیناً پاک تھی، عمل کیا، اس کو اس کا ثواب ملیگا، خدا کی توحید اور روز آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہو سکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے اور اس پر تمام اہل مذاہب کا اتفاق ہے اسلیے رسالت کی تصدیق بھی اسکے ضمن میں داخل ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ

بیشک جو اللہ اور اسکے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اس بیچ میں درمیان

ذٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (نساء: ۲۱)

کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے اہانت کرنیوالا عذاب تیار کیا ہے، اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں کسی کا کبھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدا دیگا اور خدا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

دوسری آیت میں ہے:-

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ (نور: ۹) مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبول عمل کے لیے ایمان شرط ہے، دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لیے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا، وہ چاروں ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کے ماننے والے ہیں، اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے، چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے:

قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ مَّآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصّٰبِئُونَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (مائدہ: ۱۰)

کہدے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا، اسکو قائم نہ کرو، اور (اے پیغمبر) جو تیری طرف اترا ہے، وہ انکی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا تو ان منکروں کا غم نہ کرو، اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے، اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان لایا، اور اچھے کام کیے، تو ان پر کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیت مسیح میں مبتلا ہو گئے، اس لیے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے ہیں، فرمایا:

لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ وَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُولٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰىٓ أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝ وَحَسِبُوٓا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ ۚ وَاللّٰهُ بَصِيرٌۢ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَ

بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور انکی طرف کئی رسول بھیجے جب کبھی انکے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لیکر آیا، تو انہوں نے کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی، سو اندھے ہو گئے اور بہرے، پھر خدا ان پر رجوع ہوا پھر بہتیرے اندھے اور بہرے ہو گئے، اور اللہ دیکھتا ہے وہ جو کرتے ہیں بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح ہی اللہ ہے، مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور

رَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (مائدہ ۱۰)

تمہارا رب ہے، بیشک جو اللہ کا شریک بنالے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گنہگاروں کی کوئی مدد کرنیوالا نہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے حالانکہ کوئی اللہ نہیں، مگر وہی ایک، گروہ اپنے ہی قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے "ایمان" کا حال تھا، اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے حسنِ عمل کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اسی کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے:

وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (مائدہ ۱۱)

اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس پر یہ لوگ ایمان لے آتے تو ان (مشرکوں) کو وہ اپنا دوست نہ بناتے، لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں، توحید کامل اور رسالت عمومی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلاشریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا:

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (آل عمران: ۹)

کیا وہ دین الٰہی کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہیں وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے (اے پیغمبر) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اور جو ابراہیم پر، اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اتارا، اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو انکے رب کی طرف سے ملا ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ہم انہیں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا۔

اسی آیت سے ظاہر ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے۔ اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا، آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلات باطلہ اور اتباع متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہوگئے، یعنی دین اسلام سے روگرداں ہو کر اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا:

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ

بیشک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی

21

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ، (آل عمران: ۲)

انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے، تو اگر (اے پیغمبر) یہ تجھ سے کج بحثی کریں تو کہدے کہ میں نے اور میرے پیرووں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔

اسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ، (آل عمران: ۲)

اور اے پیغمبر ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہدے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا، اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت نامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام "ہدایت نامہ" ہے یہی دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گذشتہ پیغمبر کی امت ہوں کھو دیا تھا، اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اسی لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی، وہ ناقص تھی، اور اسلام جس کو لیکر آیا وہ کامل ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا، اور اس نے نیک کام کیا، اسکو خوف و غم نہ ہوگا۔ ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود توحید کامل ہے، اور اسکا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں، یہود و نصاریٰ کیا مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں، جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو انکے رسول کے ذریعہ سے دنیا میں آئی ہے، یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابی، غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

نبوت محمدیؐ کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے، اور اسکے سوا سب ضلالت ہے، بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ بھی ایک کامل ہدایت جو اپنا اپنے وقتوں میں سب نبی لیکر آتے رہے ہیں لیکن انکے پیرو اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے، اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لیکر آخری دفعہ تشریف لائے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی کبھی ناقص نہ ہوگی، کیونکہ اس کا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلافات اور تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدیؐ کی دعوت جہاں دی گئی ہے ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے، چنانچہ اسی آیت میں جو اوپر گذری یہ ہے:۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ

اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا

فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا (آلِ عمران: ۲)

وہ اسلام لائے، اگر اسلام لائے تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔

سورۂ بقرہ میں ہے :-

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (بقرہ: ۱۶)

(اے مسلمانو!) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم پر اور اسمعیل پر اور اسحق پر اور یعقوب پر اور انکی اولاد پر اترا، اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو انکے پروردگار کی طرف سے دیا گیا (سب پر) ایمان لائے ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی، اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد پر ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کو تعلیم محمدیؐ کی طرف دعوت اسی ہدایت کے پانے کیلئے ہے جو اسلام یعنی انبیاءؑ کے دین کی آخری عبارت ہے جسکو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور اب فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ أُولٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (بقرہ: ۱)

جو اسکو جو تیری (پیغمبر) طرف اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیم محمدیؐ کو قبول کریں اور وہی نجات کامل کے مستحق ہیں،

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيٰتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ

اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے تو اس رحمت کو میں ان کیلئے لکھدونگا، جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جسکو وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو انکو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اور اچھی چیزوں کو انکے لیے حلال کرتا اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور انکے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنہوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کیساتھ اتری وہی کامیاب ہیں، کہدے (اے پیغمبر!) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے، سو اللہ

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ، (اعراف: ۲۰)

اور اس کے اس ان پڑھ پیغام رساں رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کرو تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

ان آیت میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گذشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اسلیے ضروری ہے کہ وہ دین خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا، وہ صحف الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ کے ذریعہ پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیات احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا، وہ آپ کے ذریعہ دور کی گئیں نیز آپ عالمگیر پیغمبر بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں اسلیے ہدایت تامہ، نبوت عمومی اور نجات کامل اور فلاح عام اب صرف وحی محمدی کے اندر محدود ہے۔

الغرض دین محمدیؐ کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا، اسی کو صحیفۂ محمدیؐ لیکر آیا ہے، اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا، کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحف الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے، اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقاء کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیل دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختم نبوت، حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں۔

تکمیل دین قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے، اور اس کے ذریعہ دین الٰہی اپنے تمام اصول و فروع (مناسک و مناہج و شرائع) کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئیگی، جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی، خدا نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا:-

"میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا، اور اپنا کلام اسکے منہ میں ڈالونگا، اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا، وہ سب ان سے کہے گا۔" (استثناء ۱۸-۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کے بعد انکے مانند ایک اور نبی آنیوالا تھا، جسکے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالیگا، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کیساتھ آئیگا، اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا:-

لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلائے گا (یوحنا ۱۴-۲۶)

اور وہ فارقلیط (احمد) آکر دنیا کو گناہ سے، راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا، گناہ سے اسلیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے..... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں، پر اب تم انکی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئیگی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائیگی، اسلیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو وہ سنے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی (یوحنا ۱۶-۸)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا، اور ایک آئندہ آنیوالے کا پتہ دیا، جو اس کی تکمیل کرے گا۔ آخر وہ موعود الامام (صلی اللہ علیہ وسلم) آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں، اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی دھوری بات کو کامل کرنے کے لیے آئی ہے، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں

جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے اس کی زبان سے یہ اعلان عام کیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ: ۱) آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کا دین پسند کیا۔

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو انکی سخت گیری کیلئے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے،[1] یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے، بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیے جو ہر زمانہ کیلئے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیے اس نے اپنے بعد کسی آنیوالے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا، کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنیوالے، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟

اور اسی بناء پر قرآن نے ہر جگہ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِكَ کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔

قرآن مہیمن کتب ہے اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (مائدہ: ۷) اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنیوالا۔

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ: ۷) اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اس پر شاہد سچا دی ہے۔

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے۔

ابن عباسؓ شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہؒ، قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں ان کا وہ امین اور شاہد ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اسکے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی، لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے، توراۃ جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی، اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کثرت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی، زرتشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا، اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے انکی کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا انکی بنا پر انکی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کیلئے باقی اور محفوظ رہے گا، اسکی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر: ۱) ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا اور بے شبہ ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے

یہ وعدہ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے،

[1] دیکھو آیت كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ الاٰیۃ (آل عمران: ۱۰)

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (قیامہ۔۱) بیشک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا، اور اسکا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔

اس آیت میں قرآن کی قرأت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی، فرمایا،

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۔ (حٰمٓ السجدہ : ۵)

اور بیشک، یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے، باطل اسکے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اُترا۔

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا، یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے زیر کرے گی، باطل نہ اسکے سامنے سے اسمیں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے، کیونکہ وہ ایک حکمت والے کیطرف سے اتری ہے، اسلیے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی، اور چونکہ وہ ایک سر اسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے، اس لیے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت مقدمات بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی، اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدیؐ نے ہر شک کے ازالہ کے لیے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور اب آپؐ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں، کہ دین کامل اور صحیفۂ الٰہی محفوظ ہو چکا، اور ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونیکا خطرہ دور ہو گیا، چنانچہ خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدیؐ کے بعد دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں، زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا، اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا، یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں، ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدت ادیان اور دین اسلام تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشا کیا ہے، یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا، لیکن وہ بعد کو انکے پیرؤوں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دین ازلی کو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہیگا، اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اس اصل دین پر آجائیں، جسکی تعلیم انکے پیغمبروں نے دی تھی، تو وہ بھی دین ازلی ہو گا جسکا نام اسلام ہے، اور نوحیؑ، ابراہیمیؑ، موسویؑ، عیسویؑ اور محمدیؐ دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہیگا، اسی لیے فرمایا گیا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ (نساء : ۷)

اے وہ لوگو جنکو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور انکو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گنہگاروں پر جس طرح ہم نے لعنت کی تھی، ہم ان پر لعنت کریں، اس وحی پر ایمان لاؤ، جو ہم نے اب اتاری (قرآن)، جو ان تعلیمات کی جو تمھارے پاس ہے تصدیق کرتی ہے۔

مشرکین عرب سے زیادہ اہل کتاب کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا، اسلیے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠

اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ ہو۔

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ :-

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ، (بقرہ : ۱۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا اس پر ایمان لاؤ تو جواب یا کہ جو ہم پر اترا ہم اسکو مانتے ہیں اور وہ اسکے سوا کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ یہی قرآن حق ہے اور جو انکے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے بر خلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو پیش کیا، اسکی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی یہی سبب ہے کہ اسلام نے مسلمان ہونے کیلئے صرف یہی ضروری نہیں قرار دیا کہ وہ تنہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی قرار دیا کہ وہ تمام اگلی نبوتوں اور صحیفوں پر بھی ایمان لائے چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپکے ہم وطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے تھے بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے تھے، سورۂ سبا میں ہے ؛

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (سباء : ۴)

اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب پر (یعنی تورات پر)

اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح کیساتھ فرمایا کہ جو میری عبدیت اور رسالت کیساتھ عیسیٰ ابن مریم کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کریگا، وہ جنت میں جائیگا (بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسیٰؑ) الغرض وہ ازلی ابدی دین صرف ایک ہی تھا، اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لیکر دنیا میں آئے تھے، یہی وحدتِ دین کی وہ حقیقت ہے، جس کو قرآن نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۭ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (مومنون : ۴)

اے پیغمبرو ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بیشک تم سب کی امت ایک امت ہے اور میں تم کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو، تو ان کے پیرووں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں فرمائی ہے :-

اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ (بخاری کتاب الانبیاء۔ ذکر عیسیٰ)

تمام انبیا ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے، اور مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ ۲۲) ——— وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (بقرہ : ۱)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے سورۂ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے :

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (بقرہ : ۱) — اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (توبہ : ۲۲) — جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا ۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ( ) — جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں ۔

" آخرۃ " کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے ، عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کرکے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں ، مثلاً " دنیا " کے لفظی معنی " قریب ترین " کے ہیں اور یہ صفت ہے ، اس کا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدار (گھر) ہے ، اس لیے الدنیا کا مفہوم الحیاۃ الدنیا (قریب ترین زندگی ، یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی) یا الدار الدنیا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم ہے) اسی طرح الآخر اور الآخرۃ کا مفہوم اَلْيَوْمُ الْاٰخِرُ وَالْحَيٰوةُ الْاٰخِرَةُ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ ، پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنیوالا گھر ہے (یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنیوالی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر) اور قرآن پاک میں یہ لفظ انہی معنوں میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے[۱] اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حیاۃ (زندگی) یا دار (گھر) ہے ۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی ۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (عنکبوت : ۷) — اور بیشک آخری گھر اصلی زندگی ہے ۔

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ (انعام : ۴) — اور بیشک آخری گھر بہتر ہے ۔

ان دونوں آیتوں میں دار (یعنی گھر) کا لفظ موجود ہے ۔

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (توبہ : ۶) — کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہوگئے ۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (مومنون : ۳) — جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی (زندگی) کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی ۔

ان آیتوں میں الحیاۃ الدنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ الآخرۃ سے مراد الحیاۃ الآخرۃ یعنی پچھلی زندگی ہے[۲] اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لیکر

---

[۱] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں وہاں یوم آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے ۔
[۲] دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بیشمار آیتوں میں مذکور ہے ، حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے کہ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں، یا آئیں گے، چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:-

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۝ (ابراہیم ۴:۴) — جو ایمان لائے ان کو اللہ حیات دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات (کلمۂ توحید) پر مضبوط رکھے گا۔

اس آیت میں "آخرت" سے مراد "عالم برزخ" ہے، اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی، جبکہ ہر چیز اسوقت واضح اور نمایاں ہوگی، اس لیے اس آیت "فی الآخرۃ" سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا، ایک اور حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ "قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے"۔

یوم آخر اور حیات آخرت ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے، اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے اسی لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں اس دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے، ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لیکر ابد (ہمیشہ) تک، جس میں پھر موت و فنا نہیں، پہلے دور کا نام "برزخ" اور دوسرے کا نام "بعث" یا "حشر و نشر" اور "قیامت" ہے، اور ان سب کے معنی جی اٹھنے، اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں، لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس کے عالم کا نام قرآن میں "الدار الآخرۃ" اور "عقبی الدار" وغیرہ ہے، جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) وَالْاٰخِرَةِ (آل عمران ۵:) دنیا اور آخرت میں معزز۔ سلسلۂ دعا میں ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ۝ (بقرہ ۲۵:) پروردگار ہمکو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔

کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے:

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (بقرہ ۲۷:) — ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔

اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ (نحل ۱۴:) — انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حم السجدہ ۴:) — ہم ہیں تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست۔

اور کبھی دنیا کے بجائے "اولی" (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے، فرمایا:

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (نازعات ۱:) — تو خدا نے اسکو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔

وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (لیل ۱:) — اور ہمارے ہی لیے ہے، پچھلی اور پہلی زندگی۔

(صفحہ ہذا) ۱؎ ابن ماجہ و حاکم بحوالہ کنز العمال جلد ۸ ص ۹۵ حیدر آباد دکن (ترمذی)

توراۃ وانجیل میں برزخ وقیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہیگی، مذکور نہیں ہے، لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالم برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں، شخصی موت کے بعد ہر شخص عالمِ برزخ میں داخل ہوجاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہوجاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کرلیا ہے سلسلۂ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی، دوسری زندگی کی دنیا شروع ہوجائے گی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس، اور ظل ہوگی، چنانچہ سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے۔

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ (توبہ ۱۳)

ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیاؔ، برزخؔ اور قیامتؔ ہیں۔

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے، اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہِ راست راحت ولذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا، لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نماں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ ہوں گے۔

برزخ

"برزخ" کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمان میں دو دریاؤں کا ذکر ہے، جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے، اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو انکو آپس میں ملنے نہیں دیتا۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (رحمان: ۱) ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔

اسی عجیب و غریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا (فرقان: ۵)

اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے، اور وہ کھاری کڑوا ہے، اور انکے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اسکا نام برزخ ہے، سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ :۔

وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (مومنون: ۶) اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم و رواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام "قبر" ہے، خواہ وہ خاک کے اندر، یا قعر دریا میں یا کسی درندہ یا پرندہ کے پیٹ میں، اسی لیے فرمایا :۔

وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ (حج: ۱) بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ بعث صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تودہ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لیے ہے، خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لیے قبر سے مقصود وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت و حیات کی منزلیں | قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ (مومن: ۲)

ہمارے پروردگار تونے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمائی ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (بقرہ: ۳)

کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے، پھر تم کو اسنے زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو مارے گا پھر تم کو جلائے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے، جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی،

پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کریگا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوگی جس کے بعد پھر موت نہیں، قرآن پاک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا گیا،

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ، ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ، (زمر: ۳)

بیشک تو بھی مرنیوالا ہے، اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کروگے،

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (مومنون:)

پھر تم اس کے بعد مرجانے والے ہو، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤگے۔

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی، اسکے سمجھنے کے لیے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔

نیند اور موت کی مشابہت اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیے اپنی عجیب و غریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے، جسکو ہم نیند کہتے ہیں، روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے، ایک ادراک احساس کا، اور دوسرا تدبیر و تغذیہ کا، نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلات ادراک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گرد و پیش کی مادی دنیا سے یکسر بیگانہ بن جاتے ہیں تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشوونما اور بقا کی تدبیر اور دل و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذا رسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے، اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے، اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے، لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے، اسلیے جسم کے اجزا کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے، جسکی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی بانوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے، قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى (انعام: ۷)

اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جانتا ہے جو تم نے دن میں کیا، پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ج فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (زمر: ۵)

وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو انکی موت کے وقت وفات دیتا ہے، اور جو نہیں مری ان کو انکی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے بیشک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں،

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے برزخ کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پاکر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا۔

يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسین: ۴)

اے ہماری خرابی، کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔

غزوۂ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدانِ جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل نکل کر اپنے مقتل میں خود آجاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران: ۱۶)

کہدے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کیلئے مارا جانا لکھا گیا تھا، وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔

اسی لیے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لیے اکثر بعث کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں،[1] جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ (انعام: ۷)

اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے، پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (حج: ۱)

اور بیشک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں جگائے گا۔

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ دلہن کی نیند سو جاؤ جس کو وہی جگاتا ہے، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے، یہاں تک کہ خدا اسکو اس خواب سے اٹھائے گا،[2] ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی ایک طویل و عمیق نیند کے مشابہ ہے،[3]

خواب میں لذت والم انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے خارجی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں، مگر اس کے ادراک و احساس کی تخیلی، تمثالی، یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے، اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو اسی جسم کو دیکھتا ہے، جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے، اسکے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں، نیز اسمیں درد و رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں، جو مادی دنیا میں ہیں اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے، اور اگر اسمیں لذت ملتی ہے، تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں، غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اسکی شادی و رنج اور لذت والم، اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی شادی و رنج اور لذت والم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی لذت و تکلیف، احساس و ادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جسطرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے، اسی طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے لذائذ و آلام کے مختلف مناظر اور انکے حقائق اور اسباب و علل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب و غریب مباحث سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات و معلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بحالت بیداری مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو وہ خواب میں مادی گرانی

---

[1] صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کیلئے اسوقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا؟ تو حضرت علیؓ نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی یا رسول اللہ انفسنا بید اللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا (ہماری جانیں خدا کے ہاتھ میں ہیں، وہ جب جگانا چاہتا ہے جگا دیتا ہے) اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنی میں آیا ہے۔ [2] جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر، ۱۸۰ حدیث حسن غریب۔ [3] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں فهذا المبتلى فی الرؤیا غیر انه رویا و یقظة منها الى یوم القیمة (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ) یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ گویا ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔

باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسّم شکلوں میں نمودار ہوجاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اسکو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں، بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہوجاتی ہیں، اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں اسلیے وہ تمام اچھے اور بُرے اعمال جو انسان نے عمر بھر کیے ہیں، خواہ وہ انکو آج بھول گیا ہو، مگر انکی یاد ذہن کو سونپ دی گئی ہے معدوم و مفقود نہیں ہوگئی۔

خواب کی عجیب و غریب صورتوں میں سے ایک وہ ہے جسکو تمثیل کہتے ہیں، جیسے ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمتِ کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں اور حضرت یوسفؑ نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستاروں کی صورت میں دیکھا، شاہِ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اسکے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرند اسمیں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہِ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈواتے اور بال ترشواتے حج کررہے ہیں، مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے اُحد کو موتی گلانے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وبا ایک پریشان مو کالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ کے علم کو دودھ کی اور ان کی دینداری کو لمبی قمیص کی شکل میں دیکھا[1] ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسّم شکلیں نظر آتی ہیں، مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی، دریا اور سمندر نظر آئیں گے، اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی و کالی کالی صورتیں نظر آئیں گی، اسیطرح دوسرے تغیرات خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسّم اور متشکل ہوکر دکھائی دیتے ہیں[3]۔

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں، خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسّم ہو جاتے ہیں، اگر کسی بھائی کا حق واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئیگا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کرکے اگر بخل کا اژدہا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے، تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شبِ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی، اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی۔

اسی قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا:

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ط (حجرات : ۲)

اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بُرا نہ کہے کیا تم میں کوئی پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے، سو گھن آئی تم کو۔

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (بقرہ : ۳۸)

جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ نہیں اٹھیں گے (دنیا میں نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیے ہوں۔

---

[1] یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں [2] ان خوابوں کو صحیح بخاری کتاب التعبیر میں دیکھو [3] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ ذکر برزخ۔

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا (نساء)

وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے۔

وہ خود غرض لوگ، جو بیکسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے دردِ گرسنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے، دوزخ میں انکو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا، فرمایا:

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ (حاقہ: ١)

بیشک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا، اور مسکین کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا، تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے، اسکو وہی گنہگار کھائیں گے۔

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی:

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ (بقرہ: ٣٦)

اور انکی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لیے خرچ کرتے ہیں، ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور سر دینے والوں کو جانِ نو، اور حیاتِ جاوداں کی خوشخبری دی گئی فرمایا:

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ (بقرہ: ١٩) جو خدا کی راہ میں مارا جائے، اسکو مردہ نہ کہو وہ لوگ زندہ ہیں۔

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دیگا، خدا اسکو بڑھا کر دیگا جو دوسرے کو معاف کریگا خدا اسکو معاف کریگا، جو دوسروں کی عیب پوشی کریگا خدا اسکی ستاری کریگا، قرآن و احادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا و سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے، انکی نسبت فرمایا:

سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (آل عمران: ١٨)

جس مال کا بخل کیا تھا، قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔

يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ (توبہ: ٥)

جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائیگا پھر اس سے انکی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اسکا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔

دنیا میں اللہ کے نورِ بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی، اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا، خدا اس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدمؑ سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ (طہ: ٧)

اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کیلئے تنگ گذران، اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا میرے پروردگار تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا، خدا کہیگا اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آئی رہیں تو انکو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کیساتھ اس آیت میں ہے:

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (اسرائیل) | جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا، وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

اس باب میں سب سے زیادہ مرتبح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئیگا، یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اٰتاہ اللہ مالاً فلم یؤد زکاتہ مُثِّلَ لہ مالہ شجاعاً اقرع لہ زبیبتان یطوقہ یوم القیامۃ یاخذ بلھزمتیہ ای شدقیہ یقول انا مالک انا کنزک۔ (بخاری تفسیر آل عمران ج ۲ ص ۵۵) | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اسکو اُچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائیگا جسکا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے، وہ اسکے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔

اسی طرح وہ حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال، عذاب سے بچنے کے لیے ڈھال بنکر داہنے بائیں سے نمودار ہوں گے، ایک حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتۂ الٰہی مُردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے (مثلت الشمس عند غروبھا) نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے[1]، یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوئی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے، اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں، وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لیے ایک نہر بہہ رہی ہے، اور جب اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے اس کی تعبیر میں فرمایا:

ذالک عملہ (بخاری کتاب التعبیر) | یہ نہر ان کا (نیک) عمل ہے۔

اس تمہید کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رویائے صادقہ پر غور کرو، جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں، بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے، جواب بھی قائم ہے، آپ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنیوالے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں انکے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لیے کھڑا ہے، اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اسطرح مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے، اور

[1] ابن حنبل ج ۳، سنن ابن ماجہ ذکر القبر ص ۳۶۶۔

پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے، ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے، اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لیے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو چیر نتھنے کو پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے، پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف، پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں، اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں، اور وہ چیختے ہیں، آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے، نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے، جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں، وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا، جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا، جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا، یہاں پہنچکر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیواریں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی، ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے، دروازہ کھلوایا، دروازہ کھلا تو اس کے اندر گھسے، تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا، میرے ہمراہیوں نے ان ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف و شفاف بہہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ، وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے، میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنت عدن ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے جس پر نظر اٹھا کر دیکھا سپید ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں، لو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا انھوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا، وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے کلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں، وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا، اور منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خوار ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیمؑ تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ ننھے اور کمسن بچے تھے جو فطرت پر مرے تھے، کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہؐ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ اچھے کام بھی کیے تھے، تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیے۔[1]

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نماز صبح سے غافل ہو کر بالین راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کے کلپھڑے پھاڑے جانا، زانی و زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا، اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لیے سارے غریبوں کی سونے چاندی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا، سزاؤں کے بنیادی اعمال کی تمثیل و تصویر

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر ملخصاً۔

ہے، اور آخر میں نصف حسنِ عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوءِ عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے، اور صاف و شفاف نہر کی صورت میں رحمت و مغفرتِ الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے، وہ نفس سے باہر "آفاقی" (یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی) دنیا کی اشیا کے خواص و صفات کے جاننے میں کی ہے، جن سے سائنس کی ایجادات و اختراعات کا تعلق ہے، لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے، جسکو قرآن نے انفس کہا ہے، ان انفس یا ارواح کے وصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے، ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے، اور اس پر سپرچولیزم (علم ارواح) ابھی طلسم و فریب کے عجائبات میں اسیطرح گرفتار ہے، جسطرح موجودہ عہد کے پہلے آج کے معمولی سائنٹیفک تجربے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، بہرحال ابھی تک علم نفس و روح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اسکے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معمّا ہے، بہت سے ہندو اہل فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود، یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے۔

بہرحال نفسِ انسانی کے اندرونی قویٰ کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاجِ تکمیل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین، اور خارجی وجود میں بہت سی شدید تعلق ہے مسمریزم نے جو سر تا سر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کتنی قدر واضح کردیا ہے، اسی سے معلوم ہوگا کہ مذہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے، اسقدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اسکے وجود کا اقرار کرلو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے، اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۂ تکاثر میں بیان کیا ہے :-

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ، كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ، (تکاثر: ۱)	تم کو دولت و نعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کردیا یہاں تک تم نے قبروں کو جا دیکھا، ابھی نہیں، تم آگے جان لوگے پھر ابھی نہیں، تم آگے جان لوگے، ہرگز نہیں، اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین سے اسکو دیکھ لوگے۔

بنا بریں اگر انسان اپنے اندر علم الیقین حاصل کرتے جو کمال ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (تکاثر)	نہیں یہ بات نہیں، اگر تم کو علم یقین ہو، تو دوزخ کو یہیں سے دیکھ لوگے۔

کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے، وحی الٰہی نے اسکے جواب میں کہا:

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۝ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (عنکبوت: ۶)	وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں، اسکے

لہ حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ذکر واقعات حشر۔

جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں، اور دوزخ انکو گھیرے ہوئے ہے۔

وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ائْذَن لِّي وَلَا تَفْتِنِّي ۚ أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا ۗ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ○ (توبہ۔ ۷)

اور ان میں کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالیے، ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا، بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں، اسلیے انکو یہ اپنے پاس کی دوزخ اسوقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جسکا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے، اٹھ جائے گا، اسوقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے، اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آجائیں گے، اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کرلیں گے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ (تکاثر۔ ۱)

پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لوگے۔

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا، جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں۔ اسکے بعد جب قیامت آئیگی تو ہر راز فاش ہو جائے گا۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اسطرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا، وہ علم حقیقی اور یقین تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ۔۔۔ فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (ق۔ ۲)

اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن، تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کرکے اسکے سامنے آجائیں گے، اور دوزخ منظر علم پر آجائیگی، فرمایا:

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ○ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ (نازعات۔ ۲)

جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا، جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے، یاد آجائے گا، اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔

احوال برزخ کا عین الیقین ایک طرف شاعر (ابو العتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

الموت باب وکل الناس یدخله
یالیت شعری بعد الباب ما الدار

موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے۔

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے، البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو پس پردہ کا نظارا تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے۔ فرمایا:

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ○ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِن وَرَائِهِم

جب ان گنہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ (زندگی کے پس پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر) کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھے ایکبار اور دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو مال چھوڑ کر آیا ہوں

بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ (مومنون - ٦)

اس سے شاید کوئی نیک کام کروں، ہرگز نہیں، یہ بات ہی بات ہے، جو وہ کہتا ہے اور (اب) ان گنہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آجاتی، تو اس کا شک وشبہ دفعۃً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا:

وَجَآءَتْ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِکَ مَا کُنْتَ مِنْہُ تَحِیْدُ (ق - ۱)

اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لیکر آگئی، یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت "حقیقت" کا کوئی منظر سامنے ضرور آجاتا ہے، اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں:-

بالحق من امر الاخرۃ فتبینہ للانسان حتی تثبتہ وعرفہ[1]

حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان اس کو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔

حافظ ابن کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یقول عزوجل وجاءت ایھا الانسان سکرۃ الموت بالحق ای کشفتہ لک عن الیقین الذی کنت تمتری فیہ[2]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان موت کی بیہوشی حق کو لیکر آگئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا۔

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے:

ومعنی بالحق انہ عند الموت یتضح لہ الحق ویظھر لہ صدق ماجاءت بہ الرسل من الاخبار بالبعث والوعد والوعید (ج ۵ ص ۳۷)

اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے، اور پیغمبر جس قیامت اور جزاء وسزا کی خبریں لیکر آئے تھے، ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے،

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے:

والمعنی احضرت سکرۃ الموت حقیقۃ الامر الذی نطقت بہ کتب اللہ تعالیٰ ورسلہ علیہم السلام،

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقتِ امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲، کلکتہ) اور ابو حیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحر محیط ج ۸ ص ۱۲۴ مصر) میں بھی یہی ہے،

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ (ق - ۲)

ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۱ [2] تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان ج ۹ ص ۱۹۸

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہے، لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت موت کے لیے قرآن میں اکثر "خدا کی طرف بازگشت"، یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے:-

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (جمعہ:۱)

کہدو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے، جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے، تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ:۷)

ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا (مائدہ:۱۴)

تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہ طرز ادا بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آتی ہے، اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے، جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں ان کا زاد راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا سے دار العمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی انکے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِاللَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰٓی اَجَلٌ مُّسَمًّی ج ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (انعام:۷)

اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے، اور دن کو جو کما چکے، اس کو جانتا ہے، پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔

ایک اور آیت میں ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (یونس:۳)

اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے، دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا، پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس جانے کی اطلاع دی ہے اور اہل تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبری ۱۱ ص ۶۴ مصر)

اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں، جس میں موت کا پورا نقشہ ہے، اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گنہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا:

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ۔ وَقِیْلَ مَنْ رَاقٍ

ہرگز نہیں جب روح ہنس (ہنسلی) تک آ پہنچے، اور لوگ کہیں

وَظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ ۙ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ ؕ (قیامہ : ۱)

اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا، اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آگیا، اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی، اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے:

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۚ (فجر : ۱)

اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنی مالک کے پاس چلی جا۔

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی دلکش واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں | وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اس وقت سے اس کی زندگی صرف اسکے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اسکو اب سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں:

وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَکُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ ۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِکُمْ (انعام : ۱۱)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار (مورت کی) بیہوشی میں ہوں، اور فرشتے (اپنے) ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو، آج تم کو اس ذلت کی سزا ملیگی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے، اور اسکے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے، اور تم ایک ایک کرکے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے، اور جو سامان (دنیا میں) تم کو دیا تھا جس نے تم کو مغرور بنایا تھا، اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کسطرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے، اسکے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہوجاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے

وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۔ ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (انفال : ۷)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو، یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانون عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے،

نکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے، ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے۔

فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۔ وَاَنْتُمْ حِیْنَئِذٍ

پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس

تَنْظُرُوْنَ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ، فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ، فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ، وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ، فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ (واقعہ: ۳)

وقت دیکھ رہے ہوتے ہو، اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں، لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا، تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو، تو کیوں نہیں اس روح کو پھیر لا دیتے ہو، اگر تم (اپنے انکار و تکذیب میں) سچے ہو، تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہو تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ (اس سے کچھ کم درجہ) دہنے والوں میں ہو تو تجھ پر سلامتی دہنے والوں میں سے! اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے، بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالم برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب و راحت اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گذرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گذرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کردی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ، ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (توبہ: ۱۲)

ہم ان کو دو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

"عَذَابٍ عَظِيْمٍ" سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے، اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے "دو دو" ان پر اور گذر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے، اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے، قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے:

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا، وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مومن: ۵)

اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا، آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن سے قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگاروں[1] کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزا چکھایا جاتا ہے اور ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے، اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اسکا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے، تو دوزخ، پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا مقام، اسوقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے، ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے

[1] (یہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے)

کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا، مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے[1] اور اس دن تک کے لیے کہ لوگ اٹھائے جائیں، اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے[2]۔

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الٰہی سچ ہے تو ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے، جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے، اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے، اس لیے ارشاد ہے:

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿۲۴﴾ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا (فرقان: ۳)

جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گنہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں، اور کہیں گے (کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آ رہا ہے) اب اوٹ میں ہو جائے اور ہم خدا فرماتا ہے کہ ان کے کیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار و بے سود و معدوم) جنت والے لوگ (یعنی جنت جن کو ملنے والی ہے) اس دن ان کے لیے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائیگا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے جائیں گے، اس دن راج سچا خدا کا ہوگا، اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا، اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے، اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گنہگاروں کے لیے کوئی خوشخبری نہیں، اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا، اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرارگاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خوابگاہ بنی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورۂ محمد میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گنہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں، فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (محمد: ۳)

پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں کو مارتے ہوئے، یہ اسلیے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیے، بہر حال اس سے یہ ثابت ہے کہ گنہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنۃ والنار باب عرض مقعد المیت جلد ۲ ص ۴۸۸ مصر و جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر حدیث حسن صحیح و صحیح بخاری کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ۱۸۴ و سکرات الموت ص ۹۶۴۔ [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز ص ۸۴ [3] صحیح مسلم باب عرض مقعد المیت ص ۳۹۰ مصر۔

سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے:

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓىٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ (انعام: ۱۱)

اور اگر تو دیکھے جب گنہگار، موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو اپنے جسم کے اندر سے اپنی روحیں کو، آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔

اَلْیَوْمَ جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے، جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں، اس آج سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی و تفسیر ابوالسعود و تفسیر روح المعانی آلوسی)

قوم نوحؑ کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے:

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا (نوح: ۲)

وہ ڈبو دیے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے، تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔

حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے:

وَقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ (تحریم: ۱)

اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں، اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔

سورۂ یٰسین میں ایک خیر خواہ قوم کا ذکر ہے، جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا، اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا، مرنے کے بعد جب اس کو جنت ملی، تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی، تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی:

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِیْنَ (یٰسین: ۲)

کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا، اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری، اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے:

بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ (آل عمران: ۱۷)

بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس، روزی پاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ انکو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، فرمایا:

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىٕكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (نحل: ۳)

جن کو فرشتے دگنا ہوئے، پاک صاف حالت میں وفات دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلے جنت میں چلے جاؤ۔

قبر کی اصطلاح سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں، [1] احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں، وہ عموماً قبر کی اصطلاح کیساتھ بیان ہوئی ہیں، لیکن اس لفظ "قبر" سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں، بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں، اور وہ ارواح و نفوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے، اور ان ہی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر ہے، اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے، وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے، جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا ہے، تم نیند میں ہو، اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے، مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے، یا باغ و بہار کی لذتوں میں معروف ہے، اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے، جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے، اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے، جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے، اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا، جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا، اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی، اور اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے، جسم خاکی نہیں، فرمایا، كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (مدثر: ۲) یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی"، اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم بمنزلہ آلہ کے ہے، دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ و مادیات سے پاک و بری ہوگا، تاہم اس کو اپنے جسم خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی، اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے:-

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (انفال: ۷)	اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں، ان کے منہ اور پیٹھ پر اور (کہتے ہیں) چکھو جلنے کا مزہ،

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے، مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے [2] بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ)

---

[1] بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے، اور ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں یہ غلط فہمی ان کو اس لیے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر و قبور کیساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اسی قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں، [2] اس سے اس شبہہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب و ثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں، اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے، اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو، یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے :

اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ (قیامہ ۱) اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہنکایا جانا۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے[1] اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے، اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی، اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو رویائے صادقہ پہلے گذرا ہے، اس میں جس جسمانی قالبوں میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، وہ تمام تر مثالی ہی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہداء کے وہ مثالی قالب اور گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب اور جسم نہیں ہیں جو انکی قبروں میں سڑ گل کر فنا ہوگئے، یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرے ہوا میں اڑ کر منتشر ہوگئے یا کسی جانور کے پیٹ میں جاکر اس کا جزو بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے، جس کی طرف اشارہ کیا جاسکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے، جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جاسکے، مگر قدرت الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا، اور اسکو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا[2]

سوال و جواب احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں، اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں،

اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے :

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (نحل ۴)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک صاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ (نساء ۱۴)

بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں تم کس بات میں تھے، وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا خدا کی زمین کشادہ بھی کہ تم اپنا ڈھیر چھوڑ کر باہر چلے جاتے

ایک اور آیت ہے :

حَتّٰیٓ اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوْٓا اَیْنَ

یہانتک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان

---

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز [2] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۹۵۹ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ۔

مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ (اعراف : ۴)

کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہے وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ جن کو وہ دیوتا سمجھے تھے وہ کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے، تب خدا فرمائیگا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو، جو جن وانس میں تم سے پہلے آگ میں جاچکے ہیں،

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا، اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے کہ ان سے انکی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے، جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی توحید ورسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہوگا،

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمۂ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمۂ توحید) اور کلمۂ خبیثہ (بری بات یعنی کلمۂ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمۂ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں، اسی کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں اور اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں، اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (ابراہیم : ۴)

اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھیگا اور آخرت میں بھی، اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال وجواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا، اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا، وہاں وہ بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔

ہر چند کہ رسول پاک کی صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم تائید اً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی "قول ثابت" پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ تو کشف راز کا دن ہے، اس دن تو کافر بھی (اس قول ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا، پھر یہ اہل ایمان کے لیے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی، اور نہ یہ اس اظہار احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہو سکتا تھا جہاں ہنوز اسرار پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی، اور وہ برزخ کا عالم ہے۔

اس آیت پاک کی اسی تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعت مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے،

حقیقت میں اس عالم برزخ کا سوال وجواب کوئی نیا واقعہ نہ تھا ہوگا، بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار وانکار کی مثال ہوگی، یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا یعنی اقرار و انکار

کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورۂ بالا آیات کے بعد ہے جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا انکی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں، اس کے بعد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ، (اعراف: ۵)

بیشک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، اور انکے ماننے سے غرور کیا، اور ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی، اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی، یا اپنے خاکی جسموں کے لگاؤ سے جہاں وہ سپرد خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی، اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی، اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمتِ الٰہی کا فرشتہ، بلکہ خود زبانِ رحمت اس کے کانوں میں یہ صدا دیتی ہے۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ، فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (فجر: ۱)

اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جا، تیرا پروردگار تجھ سے خوش، اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

ان سے بڑھ کر وہ پاکباز روحیں ہیں، جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا، تو انکو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے، فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ: ۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔

یہ پُرمسرت زندگی کیسی ہوگی؟ اس کی دوسری سورہ میں ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ، فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ،

اور تو انکو جو خدا کی راہ میں مارے گئے، مردہ نگمان کر، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انکو روزی ملتی ہے، خدا نے اپنی مہربانی سے انکو جو دیا ہے، اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں، انکی طرف سے بھی خوش ہیں کہ انکو نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (آل عمران ۔ ۱۷)

غمگین ہوں گے، وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں، اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

یہ پر مسرت زندگی شہداء کو ملے گی، اسی زندگی کا مقام "خدا کے پاس" بتایا گیا ہے، احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں، اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں، اس کے بعد غالباً ہر ذی عقل تسلیم کریگا کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہداء سے بہرحال اعلیٰ و برتر ہیں، اسلیے ان کا مقام بھی اسی احاطۂ قدس کے اندر ہوگا، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیرِ معراج اور اپنے رویائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔

بعض وہ سعید روحیں ہیں، جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالمِ ملکوت میں اڑ رہے تھے، عالمِ برزخ کے یہ دو اڑانے والے بازو در حقیقت ان کے ان دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں، جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے، اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ج (حم السجدہ ۔ ۴)

بیشک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے یہ خوشخبری لیکر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو، جسکا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں، اور آخرت میں بھی۔

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت، اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے،

۲۔ آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے، اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے، قومیں بھی باری باری اس بازیگاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کیلئے جگہ خالی کر جاتی ہے، یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے، کائنات جس انتظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے، اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے، غرض

ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئیگا، جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائیگی، کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائیگی، اور آسمان و زمین کے کرّے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، اور پھر وہ خلاقِ عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا، اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں، اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیا نے حیات پر موت طاری ہوگی، سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹس) کو ہو سکتا ہے، اہل فلسفہ کا بڑا گروہ اس امکان پر یقین رکھتا ہے، اور اہل سائنس بھی اس کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبیعیات و ہیئت جدید کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں، وہ اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر ہوتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے، وہ گرم آفتاب ہے، جسکی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، آخر ایک دن آئیگا، جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائیگا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائیگی، ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے، اور فضائے ہستی کے تمام سیارے روز بروز کھنچے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئیگا جب باہمی توازن باقی نہیں رہے گا، اس وقت تمام کرّے ایکدوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے، اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا،

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں، انمیں بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے، اور اسکی ساری آبادی ہباءً منثوراً ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسبابِ طبعی کچھ ہوں، مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے، اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات ہیں، اور اس میں اس کو عدالت کا دن کہا گیا ہے[1]، حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے، ایک صدوقی، جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہوگیا تھا، اور قیامت کا منکر تھا، مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا، بدستور اپنے پرانے عقیدے پر قائم تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو یہودی تھے، وہ قیامت، حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئیگی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو اور دوسری پر زمینوں کو، تیسری پر درختوں کو، چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو، اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھیگا، اور ندا آویگی کہ میں ہوں بادشاہ، انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کیساتھ مذکور ہے، حضرت عیسیٰؑ نے صدوقیوں کے مقابلہ میں توریت کی ایک آیت سے حیات اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے اور مکاشفاتِ یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے، ہندو پرلے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی، اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے، قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے، اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے، قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے، وہ یوم الدین ہے، یعنی جزا کا دن، جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا، اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جابجا ہیں:

اَلسَّاعَۃ	وہ گھڑی (وہ مقررہ وقت)	یَوْمُ الْقِیَامَۃِ	کھڑے ہونیکا دن (مردوں کے اٹھ کر کھڑے ہونیکا دن)
اَلْیَوْمُ الْحَقُّ	سچا دن (جسکے آنے میں کوئی شک ہے اور نہ جسکے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)	یَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ	جانا ہوا دن، یا مقررہ دن۔
		اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت۔
اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ	موعودہ دن۔	اَلْیَوْمُ الْاٰخِرُ	پچھلا دن۔
یَوْمُ الْاٰزِفَۃِ	قریب آنیوالی مصیبت کا دن۔	یَوْمٌ عَسِیْرٌ	ایک سخت دن۔
یَوْمٌ عَظِیْمٌ	ایک بڑا دن	یَوْمٌ عَصِیْبٌ	سخت دن۔
یَوْمُ الْبَعْثِ	جی اٹھنے کا دن		
یَوْمُ التَّلَاقِ	باہم ملنے کا دن	یَوْمُ التَّنَادِ	پکار کا دن
یَوْمُ الْجَمْعِ	اکٹھے ہونے کا دن	یَوْمُ الْحِسَابِ	حساب کا دن
یَوْمُ الْحَسْرَۃِ	حسرت کا دن	یَوْمُ الْخُرُوْجِ	قبروں سے نکلنے کا دن
یَوْمُ الْفَصْلِ	فیصلہ کا دن	اَلْقَارِعَۃُ	کھڑکھڑانے والی
اَلْغَاشِیَۃُ	چھا جانے والی	اَلطَّامَّۃُ الْکُبْرٰی	بڑی مصیبت
اَلنَّبَاُ الْعَظِیْمُ	بڑی خبر	اَلْحَاقَّۃُ	ضرور آنیوالی گھڑی

[1] زبور ۹-۱۶،۱۷-۲۰،۲۲-۲۱۰، دیاب ۹،۳۹ ر ۵۰، [2] انجیل مرقس ۱۲-۲۳ و اعمال ۲۳، [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ زمر، [4] متی ۲۲-۳۲،۳۱ و توما ۲، ۱۵ مرقس آئی ۱۸

اَلْوَعْدُ، وعدہ، اَلْوَاقِعَةُ، وقوع پذیر، اَمْرُ اللّٰهِ، خدا کی بات، اَلصَّاخَّةُ، بہرا کرنے والی گھڑی،

قیامت کے اوصاف | یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت، یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً،

یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (انعام و نمل وطٰہٰ) جس دن نرسنگا پھونکا جائے گا۔

یَوْمَ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ: ۳) جس دن بچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (شعراء: ۵) جس دن نہ مال کام آئے گا، نہ اولاد۔

وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ (فرقان: ۳) اور جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔

وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ (فرقان: ۳) اور جس دن آسمان پھٹے گا۔

وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (مومن: ۶) جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔

لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ (اٰل عمران: ۱) جس دن میں کوئی شک نہیں۔

وَیَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا (نمل: ۷) جس دن ہم ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔

یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (مطففین) جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لیے کھڑے ہوں گے۔

یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ (قمر: ۱) (جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ وَ اُمِّهٖ جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور باپ اور اپنی بیوی اور

وَاَبِیْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ (عبس: ۱) اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔

یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا (بقرہ: ۶) جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ (نور: ۳) جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔

یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا (انفطار: ۱) جس دن کوئی دوسرے کے لیے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔

یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا (دخان: ۲) جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کیے گئے ہیں، جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بیکسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز سے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا | قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض یا عدم محض کا نام ہے، حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے، چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا۔

اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (قارعۃ: ۱)

متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنیوالی، اور تم کو کس نے بتلایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنیوالی یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا، وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا (زلزال:۱)

جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی، اور انسان کہے گا، زمین کو کیا ہوا، اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ، وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ، وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ، وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ، (انشقاق:۱)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری کے لائق ہیں جب زمین پھیلائی جائیگی اور جو کچھ اسمیں ہے اسکو ڈالدے گی اور خالی ہوجائے گی۔

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ، وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ، وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ، عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ (انفطار:۱)

جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے، اس وقت ہر روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس کو جان لے گی۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (تکویر:۱)

جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا، جب ستارے تاریک ہوجائیں گے، جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ، فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ، وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ، وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ، (مرسلات:۱)

جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ وہ یقیناً ہونیوالا ہے، جب ستارے ماند کردیے جائیں گے اور جب آسمان کھولدیا جائیگا اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کردیے جائیں گے۔

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ، (قیامہ:۱)

جب نگاہ ماند ہوجائے گی، جب ماہتاب بے نور ہوجائیگا، اور آفتاب و ماہتاب اکٹھا کردیے جائیں گے،

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (معارج:۱)

جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہوجائیں گے۔

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ، وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ (الحاقہ:۱)

جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھالئے جائیں گے، اور دونوں ٹکڑے ہوجائیں گے اس دن ہونیوالی بات ہوجائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا، اور اس دن کمزور ہوجائے گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَهِيلًا، فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ وَكَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا، (مزمل:۱)

جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا، اور پہاڑ پگھلا ہوا تابا ہوجائیں گے، کیونکر متقی ہوسکتے ہیں جب اس دن کا انکار کرتے ہو جو بچوں کو بوڑھا بنادے گا، آسمان اس دن پھٹ جائیں گے، اور خدا کا وعدہ پورا ہوجائے گا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ، (ابراہیم:۷)

جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی،

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ. (رحمٰن: ۲)	جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سُرخ تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے۔
اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا. (واقعہ: ۱)	جب ہونیوالی بات ہو جائے گی، جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر وزبر کر دینے والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور پہاڑ، پراگندہ کیے جائیں گے اسوقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔
وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (نبا: ۱)	اور آسمان کھول دیئے جائیں گے، تو وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے، تو وہ سراب ہو جائیں گے۔

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظام عالم کی درہمی اور اور دنیا کی حیاتِ موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ. (ابراھیم: ۷)	جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔

قیامت کی حقیقت اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال وکیفیات کا ذکر گوناگوں طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اسمیں موجود ہے، جس میں نہایت اختصار وایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ كَلَّا لَا وَزَرَ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ن الْمُسْتَقَرُّ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ	میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنیوالے نفس کی قسم کھاتا ہوں کہ کیا (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم (اسکے مرنے کے بعد) اسکی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے، کیوں نہیں، ہم تو اسکے پوروں کو درست کر سکتے ہیں، یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھیانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیئے جائیں انسان اس دن کہیگا کہ اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ، ہرگز نہیں کہیں بچاؤ نہیں اس دن تیرے رب کے پاس ہی جا ٹھہرنا، اسدن انسان کو جو اس نے آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال ودولت) وہ بتایا جائیگا، بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے،

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝ (قیامۃ ۱) اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے۔

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روز قیامت اور نفس لوامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے، نفس لوامہ یعنی ملامت کرنیوالے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو اسکے ہر بُرے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے، اور اس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے، آخری آیت میں اسی کیفیت ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا، بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے، اگرچہ وہ زبان سے اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لیے سینکڑوں بہانے تراشا کرے انسان کی اسی قلبی کیفیت کا نام نفس لوامہ ہے۔

(۱) اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے، جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گنہگار ہوتا ہے، نیکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نیکونام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے اور انکی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے، پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اسکے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے، بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں، وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گنہگار ہوتی ہیں، نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچکر انکے عملی قویٰ کمزور اور مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں،

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں، جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر آج موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، کیا اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا یہ مجموعہ جو پیدا ہوتا، بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، کیا ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر نہ سوئیگا، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آل فرعون وغیرہ قوموں کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال اب جسطرح شخص کے اندر ایک نفس لوامہ، یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر بُرے فعل کے وقت اسکو ملامت کرتا اور اسکو گنہگار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے، تو اپنے کو قصوروار جانتا اور گنہگار سمجھتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتا ہے، اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی اور اس کا ضمیر و نفس لوامہ بھی اس کو ملامت کرے گا، کائنات انسانی سے بڑھ کر خود کائنات ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا، اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی، اسی عمومی اعتراف قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے سورۂ بالا میں نفس لوامہ و قیامت کو باہم ایک قسم یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے، اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیے۔

۲۔ اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے، اس میں سردی و گرمی، بیماری و تندرستی، بقا و فنا، اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے، وہ چیز زندہ رہتی ہے، اور جسوقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے، اسی لحہ وہ فنا ہو جاتی ہے، ایک دن ہر ایک پھول

(۱) مستفاد از تفسیر سورۂ قیامہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ۔

کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا، جب تک ان متضاد و تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی، وہ پھول شگفتہ رہا، جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی، پھول کی ہستی معرض فنا میں آگئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد، خاندان، جماعتیں، قومیں، بلکہ حیوانات، شجر، حجر، غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

پوری کائنات ہستی کو لیجئے، اس کو خلاقِ عالم نے ان ہی متضاد عناصر و اخلاط پر قائم فرمایا ہے، دن رات، روشنی، تاریکی، سردی، گرمی، پانی، آگ، بہار، خزاں، تندرستی، بیماری، دولت، افلاس، حیات و موت، آسمان، زمین، نیکی، بدی، خیر، شر، غرض جس کو بھی دیکھو، یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری متضاد قوئی اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے، ان میں جب تک اعتدال قائم ہے، اس دنیا کی کل چل رہی ہے، جس دن ان کے اعتدال میں فرق آیا وہی اس کی فنا کا دن ہوگا۔

لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے، اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہوگئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعۃً وہ پھر ابھری، اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتی نوحؑ بن کر کرۂ ارضی کو بچا لیگا، بارہا اس باغ ہستی میں خزاں آئی، اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا، اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا جانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی، یہ کرے اپنی رفتار میں لبا اوقات گرنے کے قریب پہنچے، کہ پھر سنبھل گئے، مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اسی وقت تک چل رہا ہے، جب تک ان متضاد قوی اور کائنات کے استعدادات میں اعتدال قائم ہے، جس دن اعتدال فنا ہوگا نظام ارضی کا پورا کارخانہ بھی درہم برہم ہو جائے گا، اسوقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے دے گی۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا، وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا، بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا، يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ، وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ (زلزال: ۱)

جسوقت زمین ہلائی جائیگی، اور جب وہ اندر کے بوجھوں کو اگل دیگی، اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے، اس دن وہ اپنی باتیں بیان کریگی کہ اس کے پروردگار نے اس کو حکم دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں، تو جس کی ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرا برابر بدی کی ہے، وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

صورِ قیامت قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر ہے، فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ، پھر جب صور پھونکا جائیگا، صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں، اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلان جنگ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، اسلیے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ تورات میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کس کی بادشاہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ جواب دیگا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ، اس ایک سب پر غالب آنیوالے کی، غرض وہ دن آسمان و زمین و نظم کائنات کے شہنشاہِ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرۂ حساب کے

اعلان کا ہوگا، اسلیے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لیے استعمال کیا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعۃً اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اسکی تعمیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں،

عربوں کا انکار اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے، لیکن اہل عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا جسکے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے، اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا، وہ یہی قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے، جاہلی عرب حیات بعد الموت، خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ و بازپرسش اور سزا و جزا سے قطعاً ناآشنا تھے، اسی لیے انکو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں کوئی تمیز نہ تھی جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دارومدار ہے، عرب کا شاعر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے کہ

اموت ثم بعث ثم حشر، حدیث خرافۃ یاام عمرو ، کیا موت ہے، پھر جی اٹھنا ہے، پھر اکٹھا ہونا ہے، اے ام عمرو (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں، قریش کا ایک اور شاعر کہتا ہے۔ یحدثنا النبی بان سنحیی، وکیف حیاۃ اصداء وھام ، یہ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کیے جائیں گے، حالانکہ صداء و ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟

(انکا عقیدہ تھا کہ انسان مرکر پرندہ ہوجاتا ہے، اور آواز دیتا پھرتا ہے، اسی کا نام انکے ہاں صدی اور ہام تھا)

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کیے گئے ہیں، مثلاً

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ (ق: ۱)	کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے یہ لوٹنا بہت دور ہے،
ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (نٰزعٰت: ۱)	کیا ہم دوبارہ اُلٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈی ہوجائیں گے۔
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (اسرائیل ۵، ۱۰)	کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہوجائیں گے تو ہم بناکر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔
مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (یٰس: ۵)	ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا؟

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ: ۳)	انھوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، دوسری نہیں، مرتے ہیں اور جیتے ہیں، اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔
وَقَالُوْا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (انعام: ۳)	اور انھوں نے کہا یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

انھیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا،

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا (نبا: ۱)	وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔

خبابؓ بن الارت نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، ان کے کچھ دام قریش کے ایک شخص عاص بن وائل پر واجب الادا تھے، وہ جب جاکر تقاضا کرتے تو عاص کہتا "جب تک تم محمدؐ کا انکار نہ

ۃ صحیح بخاری جلد اول باب الہجرۃ ص ۵۵۸؎

کروگے میں تم کو کچھ نہ دوں گا"۔ انہوں نے کہا یہ اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں" اس نے کہا کیا مر کر مجھے پھر جینا بھی ہے؟ انہوں نے کہا "بیشک" اس نے مذاق سے کہا "تو اچھا پھر وہیں میرا مال و دولت اور سروسامان ہوگا، وہیں تم دام بھی لے لینا"[1]۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں اہل عرب کا کفر کتنا شدید تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا، قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور موثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ان میں ہیبت الٰہی، ہنگامۂ قیامت اور حشر ونشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے، انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت وقدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے، پھر ایک طرف حیات ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا، دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی سختی اور عذاب الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحی الٰہی نے قیامت اور بہشت ودوزخ کے حالات ومناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہل نظر صحابہؓ ناواقف تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی، جس میں جنت ودوزخ کا بیان ہے، یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے، تب حلال حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے، یہ آیت کہ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ (بلکہ انکے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے، اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی) مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی کھیلتی تھی، بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگی تھی۔[2]

اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول واساس میں کیوں داخل کیا ہے، اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی، تو دلوں میں اعمال کی جزا وسزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی رجحان اور میلان ہوتا بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا وسزا کا ذکر باقی رہ گیا ہے، دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ (نحل: ۳)

تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے دل نہیں مانتے، اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔

اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے، مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ "روز جزا کا مالک" اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اسکے پیروؤں کے دلوں میں پوری طرح گھر کرلے۔

قیامت پر قرآنی دلائل قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے **اول** یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا، اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا وسزا نہ ہو تو خیر وشر اور نیکی وبدی کا فطری امتیاز لغو، اور انسانی زندگی کی تمام تر بے مقصد اور اسکے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں،

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ

(اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور

[1] صحیح بخاری تفسیر کہیعص صفحہ ۶۶۱ [2] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۴۸، باب تالیف القرآن۔

اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (مومنون: ۶) تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔
اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (قیامہ: ۲) کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری بات جو روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے، اگر اچھے اور برے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے، اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار، بدکار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں، پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دیکر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے، سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۔ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ (والتین: ۱)

لیکن جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے، ان کیلئے نہ ختم ہونیوالا اجر ہے، پھر اسکے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنیوالوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)

اسی لیے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے:۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ (ص ۳)

کیا انکو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں،

دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَمَمَاتُھُمْ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ (جاثیہ: ۲)

کیا انہوں نے جنھوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا ہے، کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے، اور نیک کام کیے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔

لوگوں کو روز جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے، یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اسلیے اسکو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اسکے ان ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحی محمدی نے اس گتھی کو اسطرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا۔

۱۔ مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت عزیرؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں گذر

ہیں اور ان سے استدلال کیا، کہ جب چند آدمی یا پرندمر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مرکر جی سکتی ہے۔

۲۔ جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے، اور پھر دفعتاً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے، سبزہ نکل آتا ہے، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش زمین انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی، وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی) اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

۳۔ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرۂ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی، جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزہ اور درخت اگلائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ انکی ایجاد پر قادر نہیں؟

۴۔ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا، خدا نے اس کو ہست و موجود کیا، پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانے کو پیدا کیا، وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا، جس نے نقش اول بنایا، نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

۵۔ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی، پھر جب انہوں نے غرور و نخوت ظلم و ستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لیے ضروری ہیں، مخالفت کی، تو وہ فنا کر دی گئیں اور انکا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قوم لوط اور قوم مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِى الْاَرْضِ (مومن ۲۱)

کیا زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛؕ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ (ابراہیم ۲)

کیا نوح کی قوم اور عاد و ثمود کی اور جو ان کے بعد تھے، جنکو خدا ہی جانتا ہے، ان کی خبر تم کو معلوم نہیں ہوئی؟

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لمن الملک بجاتی تھیں، ہزار ہا سال سے بے نشان ہیں، نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے، یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے، اب ان کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جو رومیوں کے مقابل صدیوں تک برسر پیکار رہے، اب ان کی تعداد

چند ہزار سے زیادہ نہیں، امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے مالک تھے، اب فنا کے قریب ہیں۔

الغرض جسطرح افراد جی کر مر جاتے ہیں، جماعتیں وجود میں آکر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا، جب قانونِ الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔

جسطرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں، وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں، لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے، اور اس میں شک کرتے ہیں، اسیطرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے، حالانکہ ایک وہ دن آئے گا، جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گا، کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا، اس موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے قانونِ طبعی سے منسوخ ہو جائیگا اور جیسا کہ سائنس کہتا ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے، آفتاب و ماہتاب، ستارے اور تمام اجرامِ فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (ابراہیم: ۷)

جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی، اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی۔

سورۂ قٓ میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے:

قٓ. وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ، ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ، قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ، بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ، اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ، وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ. وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ، وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ، رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ، كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ

قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے)، ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے، بلکہ ان کو اس پر تعجب ہے کہ ان میں ایک آدمی آکر ان کو (قیامت کا) ڈر سناتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہونگے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہمکو معلوم ہے کہ زمین ان (مردوں کے جسموں میں) سے جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی جب وہ ان کے پاس آئی، پس وہ الجھی باتوں میں پڑگئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمانوں کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسکو کیسا بنایا، اور کس طرح اسکو سجایا ہے کہ اسمیں کہیں سوراخ نہیں اور زمین پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اسمیں قسم قسم کی رونق کی چیزیں اگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا، پھر اس سے باغ اور کٹنے کھیت کا ناج اگائے

الرَّسِّ وَثَمُوْدُ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ، اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ، (ق: ۱)

اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں یہ بندوں کو روزی پہنچانے کیلئے ہے، اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہوگا، اور کافروں سے پہلے نوحؑ کی قوم، رس والوں اور ثمود و عاد اور فرعون اور لوطؑ کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا (ان میں سے ہر ایک نے پیغمبر کو جھٹلایا، تو میری دھمکی پوری اتری کیا ہم پہلے پیدا کرکے تھک گئے، (جو دوبارہ نہیں پیدا کرسکتے) بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سر نو پیدائش میں شک ہے۔

سورۂ قیامت میں بھی اس کا بیان ہے، اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى، (قیامہ: ۲)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھی، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا، پھر اس کو جوڑا کیا، یعنی نر اور مادہ کیا، کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے۔

وَقَالُوْا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا، اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرائیل: ۱۱)

اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو دوبارہ بھی) بنا سکتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ، (روم: ۳)

اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کریگا، اور یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لیے آسان ہے،

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ، (حج: ۱)

(لوگو) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو ہم تو پہلے تم کو (اسی مردہ مٹی سے پیدا کرچکے ہیں (جو دوبارہ کیوں نہیں پیدا کرسکتے)

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا مختصر جواب ہے۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ، (یٰس: ۵)

وہ بولا کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا، کہدے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔

غرض وحی محمدیؐ نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا، اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

حشر جسمانی اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی اسی گوشت و پوست کیساتھ ہوگی، یا صرف روحانی ہوگی، جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گذر نہ ہوگا؟ قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں

کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک پر غور کرو، کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جئے گا، کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو، اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے، اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائے گی، بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی، کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل انکے لیے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی انکے فہم سے بالاتر تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں، اس لیے مصلحتِ الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے، اور صاحبِ فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ۔ (سجدہ:۱)

اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھوجائیں گے، کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ) یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پُرتعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اس لیے انکو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد دارِ آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (سجدہ:۱)

جواب میں کہہ کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تمکو موت دیگا، پھر تم اپنے پروردگار کیطرف لوٹا دیئے جاؤگے۔

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ، اس عقیدۂ حشر کی اصل روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں، جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں، اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے، اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے، ان کے متعلق جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستانِ وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے کیا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں، ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں، لیکن جو شخص جسمانی حشر کا تصور اس لیے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا، تو اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہونا چاہیے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا ہے، بلکہ وہ سکا

تصور بھی نہیں کر سکتا ہے تعجب انسانی زندگی کا تصور کریگا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کریگا اسے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے، اس لیے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی تو ظاہر ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت اور کیفیت ہوگی، جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم کے ساتھ تسلیم کیا جائے، ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی، اب نئی بات کیا بڑھ گئی، جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھ دیا گیا۔

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے، مگر فاعل کے فاعل بننے کے آلات اور اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے جنکے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے، اسی طرح روح اپنے فعل لذت والم کے انجام دینے کے لیے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت والم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا، اس بنا پر روح محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا، کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے، اس میں بھی جسمانی پیکر و ہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

جسم و جسد | حشر جسمانی ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائیگا جسکے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی، یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائیگی، یا یہ کہ آئندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا جبکہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں، اور اسی طرح جزا و سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو، روح پر مواخذہ اور ثواب و عذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا، البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا اس کی خصوصیات و لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہوں گے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب و رویا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے، وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے، اس لیے لفظ جسم کے بولنے سے ان ہی خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے، اور نہ اس جسم پر قیاس کرکے اس جسم پر اشکالات وارد کیے جا سکتے ہیں۔

خلق جدید | چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا، وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لیے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ، بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (ق۔۱) بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے تنگ میں ہیں،

منکرین کی زبان سے کہلوایا:

ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (اسراء۔۵) کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کرکے اٹھائے جائیں گے،

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے:

اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (سبا۔۱) بیشک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (انبیاء۔۷) جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا، اسی طرح ہم اسکو دوبارہ بنائینگے،

اسی لیے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ

اس خاکی جسم کے تمام خصوصیات کا بعینہٖ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ جسم سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف و قالب کے لیے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر، کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گذشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لیے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہوں، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا (نساء: ۸)

بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم انکو آگ میں ڈالیں گے، جب انکی کھالیں پک جائیں گی ہم انکو اور کھالیں دیں گے، جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی تاکہ وہ عذاب چکھیں بیشک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی، تو پہلا حصہ جسم جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسیطرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال پر شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوا وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے، ان جسمانی اعضاء کے علاوہ ہے، اور وہ روح انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے یہی سبب ہے کہ موت و حیات، عذاب و ثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا ہے، وہ نفس یعنی روح ہے:

أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يَا حَسْرَتَىٰ عَلَىٰ مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ (زمر: ۶)

تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی،

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (حشر: ۳)

اور چاہیے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا،

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا أَحْضَرَتْ (تکویر: ۱)

(اس دن) ہر نفس جان لیگا جو اس نے حاضر کیا،

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ (انفطار: ۱)

(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا،

فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (انبیاء: ۴)

(تو اس دن) کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

جنت کی نسبت ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (سجدہ: ۲)

کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں بلکہ روح و نفس پر ڈالا گیا، اور اسی کو تکلیف و لذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوشخبری بھی اسی کو دی گئی ہے۔

فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي

اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری

جنّتی (فجر: ۱) جنت میں داخل ہوجا

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصل ذمہ دار اور جنت و دوزخ کی لذت و الم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے، اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس و آلہ احساس کی ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں یہ جسم لاکھ بار بدلے، مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے، اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے،

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں، حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا نہ ہو تو پھر اس مشتِ خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو انسان بچپن سے لیکر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لحظہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے، بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا، پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہانے، تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کر ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے، حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے کہ اس کے ذرے کیونکر ہر آن جھڑتے اور گھٹتے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا رہا وہ خون ہو کر کیونکر بدل ما یتحلل بنی، ان کی جگہ لیتی رہی، پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جسطرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لیکر بھاگا تھا، اس عرصۂ دراز میں بدل گئے ہیں، اس لیے وہ لائق تعزیر نہیں، کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا، جس طرح کل تھی بعینہٖ آج بھی ہے، اور جو تکلیف اس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی تھی، بعینہٖ آج بھی پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لیے پہلے ہی جسم کے حاضر ہونے پر زور دینا بے سود ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضاء کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہو گا، جسم کے اعضاء دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو بیماری اگلے اجزاء میں پیدا ہو گئی تھی، وہ انکے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے، مٹ نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزاء میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے ظل و عکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے، ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے، چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالاپن اور گوراپن اعمال کی سیاہی و سپیدی کی صورت میں بدل جائے گا، خدا نے فرمایا:-

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ

کتنے چہرے اس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی، اور ان پر سیاہی

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (عبس: ۱)

چھائی ہوگی۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ج فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ قف أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (آل عمران: ۱۱)

جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے، اور کتنے کالے، لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہوگئے تھے، تو اپنے کفر کرنے کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو، اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدا رہیں گے۔

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے، اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا، ان کا قد حضرت آدمؑ کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا، دوزخیوں میں کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے، دل کے اندھے، آنکھوں کے اندھے بن کر اُٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے، تو پھر صحیح وسالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی، یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے، ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

جزا اور سزا

"یوم آخر" یا "یوم دین" پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے، کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں، اسی کا نام جزا و سزا ہے، دنیا کے دوسرے مذہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہمنوا ہیں۔

جزا اور سزا دیگر مذاہب میں درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اس عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملیگا، اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے، ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس بھوس یا درخت کے قالب میں جاکر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے، اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے، اور کام کرتی ہے، اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے، جہاں نرک (دوزخ) ہیں، وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے، جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے، اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے، اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے اسوقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پاکر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جاکر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے، اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے، یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے، اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے، جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس لیے کامل اور دائمی نجات کی صورت میں یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام صادر نہ ہو، یہی ترکِ عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کرکے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے، یہاں تک کہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہوگا، اور پھر اسیطرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسیطرح شروع ہوگا، یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا، الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترکِ عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے، لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے، ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آجائے، بدی کے ساتھ

نیکی کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، اور باایں ہمہ دائمی وابدی نجات میسر نہ ہو، کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم، اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے[1]۔

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسان کو نجات دلائی ہے، انہوں نے موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے، جس میں لوگوں کو اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی۔ مختلف زردشتی فرقوں نے آریہ نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو "ارداے ویراف" کے عجیب وغریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دیکر تمام تر قبول کر لیا ہے[2]۔

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت ومشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۲-۱۹) علی ہذا حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں اخروی جزا وسزا کے اصول مذکور ہیں، نیکوکاروں کے لیے ایک ستھری آبادی کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، بدکاروں کے لیے ہلاکت، بربادی اور دردناک عذابوں کی خبر ہے، مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب وعذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں کھپایا ہے، حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے، حضرت آدمؑ کی جنت عدن اور اسکے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے، علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے، حضرت ابراہیم (پیدائش ۲۵-۸) اور یعقوب علیہما السلام (پیدائش ۴۹-۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ "جاں بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا" ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثناء ۶-۲۴) کا بھی تذکرہ ہے اور "جہنم کی آگ" (استثناء ۳۲-۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیئے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷-۱۱) روح کی بقا، اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳-۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی تذکرہ ہے (واعظ ۱۲-۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کی بھی تصریح ہے، آخر میں خدا سے ڈر اور اسکے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے، کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری، عدالت میں لائے گا۔" (واعظ ۱۲-۱۳-۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں، امثال سلیمانی میں ہے کہ "انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں، اور وہ اسکی ساری روشوں کو جانتا ہے، شریر کی بدیاں اسکو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائیگا، وہ بے تربیت پائے مر جائیگا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا پھریگا۔" (۵-۲۱)، دانیال میں ہے کہ "اسوقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں، جاگ اٹھیں گے بعض حیات ابدی لیے اور بعضے رسوائی اور ذلت کیلئے۔" (۱۲-۲) خرقیال (۲۸) میں جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے انکی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں، منجملہ انکے وہ قیامت اور حیات اخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اس کے

---

[1] تناسخ کے رد میں الندوہ مئی وجون ۱۹۱۰ء میں ایک مضمون ہے۔ [2] دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اسنے اپنی کتاب میں اسکی پوری تفصیل درج کی ہے، برٹش انسائیکلو پیڈیا مضمون صدوقیت وصدوکیز۔

مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا اپنے پرانے عقیدوں پر قائم رہا اور قیامت، حیات آخرت اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی، اور وہاں بہشتیوں کو انکی بیویاں واپس ملیں گی (مرقس ۱۲-۲۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہود اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے اور یہود کیسے ہی گنہگار ہوں، مگر چند روز سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (بقرہ-۸۰ و آل عمران-۳۰) یہ چند روز باختلاف روایت تین روز چالیس روز یا گیارہ مہینے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے، اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آکر صدوقیوں کے اس عقیدے کی تردید کی اور قیامت اور جزا و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی، حضرت عیسیٰ کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰ کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ "اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے" ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے، مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے، حضرت عیسیٰ اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں:۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا، اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں۔" (متی ۲۶-۲۹)

وہ یہودی علماء کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:۔

"اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔" (متی ۲۳-۳۳)

اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

"اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں، اور ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو، اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابراہام! مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔" (لوقا ۱۶-۲۳)

مکاشفات یوحنا میں دوزخ کو آگ اور گندھک کہا گیا ہے (۱۴-۱۰) اور متی کی انجیل میں اسکے دروازے بھی بتائے گئے ہیں (متی ۱۶-۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی اور جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے (۲۶-۱۹) وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے (لوقا ۱۶-۲۳)

اسیطرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ لینے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے،

"مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا" (رومیوں ۴-۸)

"سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔" (رومیوں ۱۴-۱۱)

"لیکن وے اس کو جو زندوں اور مردوں کا حساب کرنے کو تیار ہے، حساب دیں گے" (اول پطرس ۴-۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کیساتھ بیان ہی کیا

لے کتب سیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو سیل کا ترجمۂ قرآن حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸ ؛

بلکہ اس کے تمام ضروری اجزاء فراہم کیے، گذشتہ مذہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں، ان کے نقائص کی تکمیل کی، اور جزا و سزا کے اصول اس صفائی سے بیان کیے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہو گیا۔

آئندہ مباحث کے سمجھنے کے لیے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

عالم آخرت کا فہم و ادراک اس عالم آخر میں جو کچھ ہو گا وہ اگرچہ ہمارے اس پیش نظر اور زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہو گا، تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اسلیے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں، با ہم انکے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سنکر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں، اسی سبب سے بعض کم فہم لوگ ان کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں، اور بعض انکی تشریح و تاویل اسطرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں، اسی لیے وحی محمدیؐ نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہکر عالم آخرت کو بھی عالم آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح انکو مادہ سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ انکا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہل نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی و تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحی محمدیؐ نے ایسے جچے تلے الفاظ اختیار کیے ہیں، جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لیے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی تاکہ وہ سب کیلئے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے، ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں، جنکے چاروں طرف اس دنیا کا مادی احوال، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات لپٹے ہوئے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے، وہ سرتاپا انہی مادی قیود و لوازم کیساتھ آتا ہے، ہم جب آگ کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، جسکو ہم یہاں دیکھتے ہیں، جو انسانوں، درختوں اور ہر اس چیز کو جو اسکے اندر ہوتی ہے، بلا تمیز یکساں جلا دیتی ہے، مگر اخروی آگ ایسی نہ ہو گی، اس کے اندر بعض درخت ہونگے جو نہیں جلیں گے، وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں کو چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، اور وہ ایسی تیز و گرم ہو گی کہ یہ دنیاوی آگ اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے، "وزن" لفظ سننے کے ساتھ اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں، ترازو، پاسنگ، پلے، ڈنڈی اور تولی جانیوالی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا، اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی، اس بنا پر ان الفاظ کے لغوی معنی اور انکے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلاف آرا کی بڑی گنجائش ہے، اسلیے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اسطرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے انکے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے، با ایں ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرے سے خارج نہ

کیا جائے، جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پا جانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں کیا اگر مراد الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کیے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا ہے، مگر ایسا نہیں کیا تا کہ اسلام مختلف العقول انسانوں کیلئے عالمگیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ عالم آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لیے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ تمام قوانین فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائیگا، تو معاً اس کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے، جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ ارباب عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلولات و مسببات اور انکے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہے، وہ محض عادی ہے، یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علل و اسباب اور انکے نتائج کارفرما ہیں، وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں، اگر خدائے تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے، یا نیا عالم خلق کرے، تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور انکے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں، نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں، وحی محمدیؐ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم: ۷) جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائیگی اور آسمان (نئے آسمانوں سے)

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے، جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری ہیں، اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جزا و سزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وَهُوَ الْهَادِي إِلَى الصَّوَابِ۔

اصول جزا اللہ تعالیٰ نے جسطرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جسکو اہل فلسفہ قانون قدرت اور اہل مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جسکے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے، انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ اصول فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جسطرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مر جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی اصول فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جسطرح اصول حفظان صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے، اسی طرح اصول تزکیۂ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے، پھر جسطرح دوا اصول حفظان صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے، ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ سے وہ شفایاب بھی ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم و نتائج غرض جسطرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے، اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی

ہے، تو اسکے ساتھ اسکے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے، غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے، اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جسطرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی، اور ان معنوی، روحانی و نفسانی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی و طبیعاتی اشیاء میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد، اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں، جسطرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور انکی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے اسیطرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا، انبیاء علیہم السلام کا کام ہے، اور انکی اس تعلیم کا نام شریعت ہے، انبیاءؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے، جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہمکو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس)، اور سوشیالوجی، (علم الاجتماع) کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب و ثواب ردِ عمل ہے الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و ردعمل کے جس اصول پر مبنی ہے، اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے، یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب کہا گیا ہے، قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے، جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے کے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے،

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو، چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے،

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (جاثیہ : ۱) — جو تم کرتے تھے وہی آج بدلہ پاؤ گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردِ عمل (ری ایکشن) کا نام ہے، ایک اور جگہ ہے:

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ : ۱) — تاکہ ہر جان کا اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کرتی ہے،

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا و سزا تمامتر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں،

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (نحل : ۴) — تو ان کے بُرے کام ان پر پڑے، اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔

غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر دے رہا ہوں، تو جو کوئی جزائے خیر پائے، وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔[1]

---

[1] صحیح مسلم ترمذی کتاب الزہد و مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۵۴-۱۶۰-۱۶۵ اور ادب المفرد و بخاری باب الظلم۔

حصولِ راحت کا اصول

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں، عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرۃ یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آئندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ انکی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی خوش آیند ہے، مگر وہ نسیہ ہے اور انکا اصول یہ ہے کہ نقد را بہ نسیہ مگذار۔ لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے، فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانیں جوکھم میں ڈالتے ہیں تاکہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے، تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ دولت فردا سے بہرہ مند ہوں، ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تاکہ اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو، لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اُٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں، تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لا سکے اور تنگدستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اسلیے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائیدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو، مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اسکے دوام و ر کامیابی کا ہم کو یقین ہو، کیونکہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں اسی کے لیے ایمان کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں، جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا، ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی، اسی لیے گنہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ (قیامت ۱)

(ہرگز نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو، اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو)

حالانکہ انسان اسی اصول کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے، اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ چیز ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا، تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے، غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی، یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے۔

وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا (دھر:۱) اور خدا نے انکے صبر کرنے پر انکو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی۔

یہ صبر کیا تھا، دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تاکہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور یہاں ادنے نیکی اور احتراز جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت، تاکہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حُفَّتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے، اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے، نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلبگار ہوتے ہیں اسلیے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے، اور جو دین و دیانت اور نکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے، وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے یہی فلسفہ قرآنِ پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی (نازعات: ۲)
لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے،

نامۂ عمل ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہوجاتی ہے، پھر وہ بے حکم خدا فنا نہیں ہوتی، اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے، موجودہ سائنس نے بھی یہ اصول تسلیم کرلیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے، اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں) وہ اعمال و افعال کے دوام وجود کے اسلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرسکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لیے گویا بھرا ہے۔

قرآنِ پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے،

ھُنَالِکَ تَبْلُوْا کُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ (یونس: ۳)
اسوقت ہر جان جو اسنے پہلے کیا، اس کو آزمالے گی۔

کُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا کَسَبَ رَھِیْنٌ (طور: ۱)
ہر آدمی اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔

کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ (مدثر: ۲)
ہر جان اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ (زلزال)
تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا، وہ اسکو دیکھیگا، اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا، وہ اسکو بھی دیکھے گا۔

یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ (آل عمران)
جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کیے وہ بھی۔

یہ بات کہ ہر انسان کا ہر عمل و فعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوجاتا ہے، اسکو قرآن نے کئی طرح نقشے ادا کیا ہے، ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے خدائی شاہد اسکو سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کرلیتے ہیں۔

اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ۝ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (ق: ۲)
جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک نگراں اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ط بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ٥ (زخرف: ۷)

کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال کو لکھتے ہیں،

اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ٥ (یونس: ۲)

بیشک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے:

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ (یونس: ۷)

اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا، اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو، لیکن ہم موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں لگے ہوتے ہو،

کبھی یہ کہا ہے کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فردِ عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو۔

فرمایا:-

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا، اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا، (بنی اسرائیل: ۲)

اور ہم نے ہر انسان کا نتیجۂ عمل، اس کی گردن میں چپکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم دفتر کر کے نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا کہ اپنا دفتر پڑھ لے، آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو یہ سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلمبند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اسمیں درج ہوتی ہے اسی طرح یہ اعمالِ انسانی فراموش نہ ہونگے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا ط وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ط وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ٥ (کہف: ۶)

اور نامۂ اعمال رکھا جائیگا، تو گنہگاروں کو تو دیکھا اسمیں جو کچھ لکھا اس سے ڈر رہے ہونگے، اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اسکو شمار کر لیا اور جو کچھ انھوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے، اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

ہاں ہم اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامۂ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے، تو اسمیں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے، مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، اسی لیے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، بہر حال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہیگا، اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا، اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضاء کی شہادت انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا برا اثر چھوڑ جاتا ہے، اگر

دل کا آئینہ صاف ہو، تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے، فرمایا:

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (قیامہ ۱) — بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے، اگرچہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (تطفیف) — نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

گویا اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے، اور اگر اسی طرح گناہ کئے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے[1]۔

اسی طرح وہ اپنے جن اعضاء سے جو برا کام کرتا ہے، اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں، آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالم غیب کو چھوڑ و اسی عالم ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں، انسانوں کے چہروں، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوانِ بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں انکے اعمال کے آثار و نتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہونگے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (رحمان ۲) — گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لیے جائیں گے۔

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبانِ قال پر خداوند عدالت کے رعب و جلال سے مہر سکوت پڑ جائے گی، اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک اس کے اعمالِ بد پر گواہی دیدیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فرمایا:

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (یٰسین) — اے گنہگارو! آج نیکو کاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ جاؤ، آج ہم انکے منہ پر مہر لگا دیں گے، اور انکے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں انکے کرتوتوں کی گواہی دیں گے،

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حم السجدہ) — اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائینگے، اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انکے کانوں آنکھوں اور انکی کھالوں نے ان پر انکے کرتوتوں کی گواہی دی، انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی، کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔

اس لیے ان اعضاء کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی، جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے، لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کو گویائی مراد لیکر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان: اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا

[1] ترمذی۔

زیادہ یا دونوں برابر، دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کر علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لیے وزن اور حساب سے عموماً عدل و انصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے،

اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انکو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا:

جَزَآءً وِفَاقًا، (نبا ۔ ۱) — پورا پورا بدلہ

اس برابری اور کمال عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ ج فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (اعراف ۔ ۱) — پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے، اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں، جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں، سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ط وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ لا فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (قارعہ) — تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود، اعمال خیر کی کمی و بیشی ہے، پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق و عدل ہے، اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الٰہی میں موجود ہوگا، اور وہ کسی طرح بیش و کم نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے، ایک جگہ ہے،

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ (شوریٰ ۔ ۲) — وہ اللہ جس کتاب کو حق کیساتھ اتارا، اور میزان کو۔

یعنی کتاب الٰہی، حقانیت کیساتھ اتری ہے، اور اسی کیساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کا عمل رکھا ہے، اسکو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے:

وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (رحمٰن) — اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔

حساب کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے، اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے، چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کیساتھ مذکور ہے، اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ط وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (انبیاء ۔ ۳) — اور ہم قیامت کے دن کیلئے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم لے آئیں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے، اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی وزن معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائیگا، اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن بہر حال وزن و حساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے، تو وہ بھی حق پر ہے،

جنت و دوزخ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصودِ الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواحِ انسانی کو سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں، مگر اس سعادت و ترقی کی بنیاد خدا نے اعمالِ نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقتِ انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں "بہشت" ہے، اور اس عالم کا نام جہاں جاکر نیکیوں کی تلافی اور گذشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی "دوزخ" ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے، مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جو تورات اور قرآنِ پاک میں مذکور ہے وہ آغازِ خلقت کی محض تاریخ نہیں وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے انکو اور انکی نسل کو ہمیشہ کے لیے دیدی گئی تھی، مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے، مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ انکی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر ظاہر کر چکا تھا کہ

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ: ۴) میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں،

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے، مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے انکو جنت میں رکھنا، پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدمؑ اور انکی نسل کی اصل جگہ یہی جنت ہے، مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے، اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا، چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥ (بقرہ: ۴)

ہم نے کہا کہ تم سب اس جنت سے اترو، پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم، اور جنہوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا، تو وہی ہیں دوزخ والے وہ اس میں رہا کریں گے،

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہ: ۷)

خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا، اور نہ بدبخت ہوگا، اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا، تو اس کیلئے تنگ معاش ہوگی، اور قیامت میں ہم اسکو اندھا اٹھائیں گے۔

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا، تورات کی رو سے آدم

کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے، لیکن آدم نے اس کو کھالیا، اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا، آخر خدا نے انکو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں، جب وہ جنت سے نکالے گئے تو ان سے کہا گیا (سفر تکوین ۳: ۲)

"اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اسے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا، اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹکٹارے اگائے گی، اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا، جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔"

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدمؑ کو روکا گیا تھا، تصریحاً مذکور نہیں لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا۔ اور شیطان نے یہ کہکر انکو کھلایا کہ یہ "حیات جاوید اور ملک جاودانی کا درخت ہے"، مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی برہنگی کا علم ہوگیا، جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے، فرمایا:

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ۝ فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا (طٰہٰ: ۷)

شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیات جاودانی اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں تو آدم اور حوا دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو انکی بری چیزیں ان پر کھل گئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ "حیات جاودانی" اور "غیر فانی بادشاہی" سے مقصود کیا ہے، ظاہر ہے کہ جنت سے شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں تم اب ہو بے دردِ سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں، انسان کی خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا، یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے، ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے، وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے گرانبار نہیں، غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی، چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی، فرمایا: وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (والشمس ۱) اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم پھر نفس میں اس کی بدی اور اسکی نیکی کو الہام کیا

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ (احزاب ۹)

ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسانوں نے اس کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں اور شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے، اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے،

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیف شرعی کی امانت کو اٹھالیا، جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا، اور وہ اس تکلیف شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی، لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت

اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں، کہ اس کی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے، لیکن اگر کاشتکار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے، تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا،

غرض اس طرح وہ مصلحتِ الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیاتِ جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جد و جہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا، اور جسے شیطان نے آدم کو بلا سعی و محنت، محض بخت و اتفاق سے دلوانا چاہتا تھا، بالآخر اس کا ملنا تقدیرِ الٰہی، جد و جہد، سعی و عمل اور نظامِ ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعہ سے مقرر ہوا، جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا، فرمان آیا۔

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (بقرہ: ۴)

یہاں سے تم سب اترو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی، تو ان کو نہ ڈر ہوگا، نہ غم،

اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ (طٰہٰ: ۱)

تم دونوں یہاں سے نیچے اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی، تو وہ نہ گمراہ ہوگا، اور نہ بدبخت۔

جب انسان کا اصل مقام وہی حیاتِ جاوید اور مملکتِ ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے، اور اسی حیاتِ فانی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزد و معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے۔

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ (طٰہٰ: ۷)

تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کر دے تو پھر تو مشقت میں پڑ جائے اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔

آدمؑ اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی، ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی معلوم ہوئی، اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی، اور زمین میں آ کر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا، یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں، ان ہی کو اپنے ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا، جسکے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا، یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی، اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاقِ انسانی کی قدر پیدا ہوئی، اور پھر اس لئے تاکہ اس حیاتِ فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے، عرفانِ الٰہی (عقائد صحیح) اور عباداتِ الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی، جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے:

اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (مومنون:۱)

یہی وہ میراث لینے والے ہیں، جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعہ ملیگی، چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی،

وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ ج وَاَنْتُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَتِلْکَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (زخرف:۷)

اور اس جنت میں وہ کچھ ہے، جسکو دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اسمیں ہمیشہ رہنا ہے، اور یہی وہ جنت ہے جسکے وارث اپنے کاموں کے بدلہ تم بنائے گئے۔

اور ان ہی کو منادیٔ غیب یہ ندا دے گا:

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْکُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (اعراف:۵)

اور ان کو پکار کر کہا گیا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث اپنے ان کاموں کے بدلہ بنائے گئے۔

ملت توحید کے مبلغ اعظم ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِیْمِ (شعراء:۵)

اور مجھ کو باغ نعمت کے وارثوں سے بنا،

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام "تقوٰی" ہے۔

تِلْکَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ کَانَ تَقِیًّا، (مریم:۴)

یہ وہ بہشت ہے جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے جو تقوٰی والا ہوگا۔

انسانی جزا و سزا کے تین گھر انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالم موت یا عالم برزخ ہے، اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جسکو دارِ آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا و سزا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے، اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدیؐ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی جزا و سزا کا مقام قرار دیا۔ انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا و سزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے، گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو، اسکے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سزا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اسکے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائیگا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا، تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کیلئے پیدا کیا جائیگا، اور اسوقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزا و سزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دار الجزاء غرض انسان کا پہلا دار الجزاء یہی دنیا ہے، گو اسکے ہر نیک و بد فعل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی میں ملتی ہے، لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اسکو کچھ نہ کچھ جزا ملا کرتی ہے انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت، یہ سب اس زندگی کے

اعمالِ خیر کے نتائج ہیں، ان کے برخلاف، ذلت، رسوائی، بے عزتی، کسمپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم، خوف، محکومیت اس کے اعمالِ بد کے اثرات ہیں۔

یہودیوں کی توراۃ میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دارالجزاء کو دی گئی ہے، بلکہ توراۃ میں یہی خیال سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کے رنج و راحت کی صورت میں اسی زندگی میں ہے کہ تم خدا کے حکموں پر عمل کرو گے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی، اولادیں برومند ہوں گی، جانور جنیں گے، درخت پھل دیں گے اور دشمن مغلوب ہوں گے، اور اگر خدا کی نافرمانی کرو گے تو تم پر وبائیں آئیں گی، قحط پڑیں گے، اولادیں جیتی نہ رہیں گی، جانور مر جائیں گے، شہر تباہ ہو جائیں گے، باغ پھل نہ دیں گے، اور دشمن تم پر چھا جائیں گے، عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے، اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس دعوت کو لیکر آئے وہ یہودیت اور عیسائیت کے ان افراط و تفریط دونوں سے پاک ہے، اس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اس دنیا کی بھی، زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنت بھی، یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی، اور وہاں کی باغ و بہار بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران: ۱۵)

تو خدا نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا، اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی، اور اللہ نیکی کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔

ایمان اور عمل صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (فتح: ۴)

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔

اور یہ بھی اُن ہی سے وعدہ ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور: ۷)

خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا، جس طرح ان سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا،

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائیدار ہے، اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے، اور اسی دنیا کے حسن عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۗ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ (نحل: ۴)

جنہوں نے نیک کام کیے، اس دنیا میں ان کے لیے بھلائی ہے، اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے، اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا، اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی فرمایا:

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ (حج: ۲)

اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (بقرہ: ۱۴)

ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے، اور آخرت میں بڑی مار ہے۔

حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (بقرہ: ۲۷)

ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔

یہ بھی فرمایا :-

فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (آل عمران: ۶) تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے :-

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (طٰہٰ: ۷)

اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگ گزران ہے، اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھاؤں گا کر وہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا۔

اشارہ ہے کہ خود صحابہ کو جنگ احد میں فتح نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی انکی بعض فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا،

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا (آل عمران: ۱۶)

تم میں سے جو لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں، پیچھے ہٹے انکے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا :

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (شوریٰ: ۴)

جو مصیبت تم کو پہنچی، وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اللہ وہ بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے۔

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، عذاب کے موقع پر فرمایا :-

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ (آل عمران: ۱۲)

ان پر ذلت ماری گئی جہاں پائے گئے، لیکن (جہاں عزت ملی ہے) وہ خدا کے ذریعہ لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غضب کما لائے اور ان پر (قومی) محتاجی ماری گئی، یہ اس لیے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے، اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدود الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔

اس کے بالمقابل عام اہل کتاب سے کہا گیا :

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ (مائدہ: ۹)

اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف انکے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا، اسکو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (بہ شکل برکات آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے (از زمین خیر و برکت) سے کھاتے۔

ایک اور موقع پر اشارہ ہے :

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ

اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کو کھولتے، لیکن انہوں نے خدا کے حکم

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ، (اعراف: ۱۲) کو جھٹلایا، تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔

مگر یہ دار الجزاء فانی ہے | لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیے، اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے، مگر کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دار الجزاء جس کا نام دنیا ہے، عارضی اور فانی ہے، یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے، اسلیے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصلی مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے، جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لیے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو بھول نہیں جانا چاہیے، اس مسافر کی عقل سلیم کی داد کون دیگا، جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدابہار وطن کو فراموش کر بیٹھے،

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ، (اعلیٰ ۱) بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو، حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پائیدار ہے۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (یوسف: ۷) اور بیشک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے۔

اسی طرح گنہگاروں کے لیے یہاں کی ذلت اور رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت و رسوائی کا مقام ہے۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (زمر: ۳) تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا، اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے،

اس دنیا کی ذلت و رسوائی تو شاید سہہ بھی لیجائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہہ سکتا ہے کہ

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ، (طٰہٰ: ۷) اور آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے۔

اس لیے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کے بدولت جو زور و قوت، جاہ و جلال، نعمت و مال، اور حکومت و سروری ملے، ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہیے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ط (قصص: ۸) اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول، اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور (اس دولت سے) زمین میں خرابی نہ چاہ۔

چنانچہ ناخلف یہود کی تباہی اسی لیے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جاہ داد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا،

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ج وَاِنْ تو ان کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے جو اس نیلے کے سامان کا اسباب کر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا ہی سامان

يَاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (اعراف: ۲۱)

اسباب پھر آئے تو پھر لیں، کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں، اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں،

یہ دار الجزاء دار الاصلاح بھی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا، اور اس ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتا دیا کہ اس مقام کا دائمی وابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو حاصل ہو سکتا ہے، اور یہ دنیاوی زندگی اسی لیے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدا بہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے، پھر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے مواقع عنایت کیے، رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لیے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر متنبہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو، اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے حسب ذیل مراتب مقرر کیے۔

۱۔ نیکی سے برائی کا کفارہ، چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اسلیے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جسکی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے، یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے،" اسی کا نام کفارۂ عمل ہے،" چنانچہ وحی محمدیؐ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ھود: ۱۰)

بے شبہ نیکیاں، برائیوں کو دور کر دیتی ہیں،

اس آیت کا یہ بھی منشاء ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوشخبری اسمیں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (نساء: ۵)

تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، اگر ان میں کی بری باتوں سے تم بچتے رہوگے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے، اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ (مائدہ: ۱)

البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ، اور ان کی مدد کروگے، اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دوگے تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا، اور تم کو ان جنتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں،

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ (احقاف ۲)

یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگذر کریں گے۔

۲۔ توبہ کفارہ ہے، انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور گناہوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نکوکاری کا خدا سے مستحکم عہد کرے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی خدا کی آغوش محبت میں لا کر ڈال دیتی ہے، آدم علیہ السلام کا قصور، اور پھر ان کی توبہ، اور رحمت الٰہی کا رجوع، واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت، کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے، رحمت الٰہی کے اس پُر جوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے، اس سے ہندوستان کا برمت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم، اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے، وہ گویا رب العٰلمین کی طرف سے رحمۃ للعٰلمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا:

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا (مریم ۴)

مگر جس نے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک کام کیے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی، اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (فرقان)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں، جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اور یہی اس کی شانِ رحمت کا اقتضا ہے، یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان کو بھی بشارت ہے،

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ، أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، (مائدہ ۶)

تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھار لیا تو بیشک اللہ اس پر رجوع ہوگا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ

وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ، (طٰہٰ ۴)

اور بیشک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک کام کیے اور پھر راہ پر چلا،

لیکن توبہ کس کے لیے ہے، اور کس شرط کے ساتھ ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا، وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ (نساء: ۳)

اللہ کو ان کی توبہ قبول کرنی ضرور ہے، جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں تو یہی وہ ہیں جنکو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے، اور حکمت والا ہے اور انکی توبہ نہیں ہے، جو برُے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو، اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرلے، اور اس کے بعد اتفاقاً موت آجائے تو یقیناً رحمتِ الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی۔

وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (اعراف: ۱۹)

اور جنھوں نے برُے کام کیے پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا تو بیشک تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

وَمَن يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَّحِيمًا (نساء: ۱۶)

اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو وہ اللہ کو بخشش والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔

۳۔ مصائب کی تنبیہ اور کفارہ، دنیا میں انسان کو مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہوشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے، صبر استقلال، تواضع، شکر محبت، اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت ان ہی مصائب کے زیرِ سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے، تو سنبھل جاتا ہے، اس لیے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کیلئے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ انکی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بیقرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت و نعمت اور کامیابی و مسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہوسکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہو اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا ہی نازاں ہو، لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے، تو دفعۃً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگدستی، عزیزوں کی موت، آرزوؤں کی ناکامی ان میں ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جسکو کھا کر سرمستِ سرمست راہگیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لیے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی تکلیف سے بندہ میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جابجا بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے، تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں، اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و اصلاح کی فکر کریں، فرمایا:۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (اعراف: ۱۶)

اور بیشک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (اعراف: ۲۱)

اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا تاکہ وہ شاید باز آئیں۔

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ (اعراف: ۱۲)

اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن وہاں کے رہنے والے کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا تاکہ وہ شاید گڑگڑائیں۔

مسلمانوں سے فرمایا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ط اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ: ۱۹)

اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو خوشخبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔

اس اصول کے تحت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (نساء، ۱۸) جو کوئی برائی کرے گا، اس کا بدلہ اسکو دیا جائے گا، تو میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطلب پوچھا، فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ پر عتاب ہے، اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے، جیسے اس کو بخار آجائے، یا وہ کسی اور مصیبت سے دوچار ہوئے، یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اسکو پہنچے، وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے، یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اسطرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے، جیسے بھٹی سے سونا۔[1] دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی ہے، لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے، تیسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان

[1] یہ اور اس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں مثلاً ترمذی تفسیر آخر النساء و سنن ابی داؤد داؤد کتاب الجنائز۔

کو کوئی تکلیف یا بیماری، یا غم، یا اذیت نہیں پہنچتی، لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی،، چوتھی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لیکر اوپر تک جتنی بھی پہنچے، اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں، پانچویں روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا، اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی، تو وہ اس کے لیے کفارہ، اور اس کو اس گناہ سے پاک وصاف بنانے والی شے[۲]۔،،

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرار توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہوگیا ہو دنیا میں توبۂ اعمالِ نیک اور مصائب پر صبر وشکر کے ذریعے نجات پاسکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک وصاف ہوکر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارہ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی لیے قرآن پاک میں ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (سجدہ: ۲)	اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذاب الٰہی کا مقصد انتقام اور نفس سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہِ راست پر لانا ہے، اسی لیے ایک اور آیت میں فرمایا:۔

مَّا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا (نساء: ۲۱)	اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کریگا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا نیکیوں کا قبول کرنیوالا تمہارے ہر عمل کو جاننے والا ہے،

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے؛ اور عالم برزخ اور عالم بعث چونکہ نئے عمل کے محل نہیں، اس لیے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کوئی سوال نہیں پیدا ہوسکتا، صرف گذشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے، اور یہی عالم برزخ اور عالم بعث کے عذابوں کا مقصد ہے، الّا یہ کہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے، اور معاف فرمائے،

عذاب برزخ بھی کفارہ ہے لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اسکی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمال بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک وصاف بننا پڑیگا، یہی عالم برزخ کا عذاب ہے؛ اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لیے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے سے جو تھوڑی سی تکلیف پیش آتی ہے، اسکو برداشت کرکے اچھے کام جو نہیں کیے ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آکر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں، تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک وصاف ہوسکیں تو پاک وصاف ہوکر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں، جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے، یعنی انکی ہے جو یا سرے سے کسی گناہ کے مرتکب

---

[۱] صحیح بخاری اوائل کتاب المرضیٰ میں یہ تینوں روایتیں ہیں [۲] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیۃ۔

نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے، مگر اعمالِ نیک، توبہ اور مصائب میں صبر وشکر کرکے یا برزخ میں سزا پاکر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پاگئے،

یہ بات کہ عذابِ برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بنا پر عذاب برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا، قرآنِ پاک کی بعض آیتوں سے یہ بات بھی کنایۃً نکلتی ہے:

گنہگار حشر کے دن کہیں گے،

وَبَلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِیْ اَجَّلْتَ لَنَا (انعام: ۱۵) — اور ہم مقررہ وقت جسکو تونے ہمارے لیے مقرر کیا تھا، پہنچ چکے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے،

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے، کنز العمال میں ایک حدیث ہے،

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اِنَّ طُوْلَ مَقَامِ اُمَّتِیْ فِیْ قُبُوْرِہِمْ تَمْحِیْصٌ لِذُنُوْبِہِمْ (کنز العمال، باب عذاب القبر جلد ۸ ص ۹۶) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے،

اسی لیے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اَکْثَرُ عَذَابِ اُمَّتِیْ فِیْ قُبُوْرِہِمْ،[1] — میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب انکی قبروں میں ہوگا۔

اس حدیث کا اگر وہ ثابت ہو تو منشا یہ ہے کہ امتِ محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن قیم ایک موقع پر لکھتے ہیں:-

فَاِنْ وَفَتْ بِالْخُلُوْصِ مِنْہَا فِیْ ہٰذِہِ الدَّارِ وَاِلَّا فَفِی الْبَرْزَخِ، فَاِنْ وَفٰی بِالْخَلَاصِ وَاِلَّا فَفِیْ مَوْقِفِ الْقِیَامَۃِ وَاَھْوَالِہَا مَا یُخَلِّصُہُمْ مِنْ تِلْکَ الْبَقِیَّۃِ،[2] — اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کیلئے پورا ہوگیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائیگا، تو اگر یہ نجات کے لیے کافی ہوگیا، تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلائیں گے،

رویائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گذر چکی ہے، وہ منظر دکھایا گیا ہے، جس میں گنہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہرِ حیات میں نئی زندگی پاکر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں،[3] غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے،

وَیَوْمَ یَحْشُرُہُمْ جَمِیْعًا ج یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَکْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ج وَقَالَ اَوْلِیٰٓؤُہُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْ — اور جس دن وہاں سب کو اکٹھا کریگا اے گروہ جن! تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنالیا اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا

[1] اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ باب الوقائع الحشریہ میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا اصل ماخذ معلوم نہ ہوسکا۔ [2] شفاء العلیل لابن القیم مطبع حسینیہ مصر ص ۲۲۴ [3] صحیح بخاری کتاب التعبیر:

اَجَّلْتَ لَنَا، (انعام ۱۵) اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے ٹھہرایا تھا، پہنچ چکے،

یہ الفاظ کہ ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا، پہنچ چکے، یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے، اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے، جواب ملے گا،

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۗ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (انعام ۱۵) فرمائیگا، آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا اسمیں سدا رہوگے، لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے بیشک تیرا رب حکمت اور علم والا ہے،

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی، اس لیے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے، پھر جب خدا چاہے گا، تم کو اس سے نجات دیگا، اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے، اسکے علم و حکمت اور مصلحت کا جب تقاضا ہوگا، تم کو نجات ملے گی۔

عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے ابھی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے،

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا، (نساء ۲۱) خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام، اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا تمہاری شکر گذاری کو قبول کرنیوالا اور تمہارے دلوں کے حال کو جاننے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو گنہگاروں کے عذاب سے کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی، نہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے گنہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں، لیکن ازل سے اسنے اپنے جو قانون مقرر کر دیئے ہیں، وہ انکو توڑتا بھی نہیں جس وقت آدمؑ کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل کریں، اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سُنا دیا گیا تھا۔

اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ ۴) یہاں سے تم سب اترو، تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ غمگین ہونگے، اور جنہوں نے ناشکری کی، اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے ہونگے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت میں مستحق دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ایک کفران اور دوسری تکذیب، دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذاب دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بالمقابل ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاق جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاق دوزخ کے اسباب ہیں، بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروع اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں،

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کرکے دوزخ کا ایندھن بنائے، بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیے پیدا کیا، غیظ و غضب کے اظہار کے لیے نہیں، فرمایا:۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا ہم نے یہ امانت آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اسکے اُٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے انکو اُٹھایا

---

[1] حسب تفسیر ابن عباسؓ، ابن جریر طبری ج ۸ ص ۲۳ مصر۔

الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (احزاب : ۹)

کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق کرنیوالوں اور نفاق کرنیوالیوں اور شرک کرنیوالوں اور شرک کرنیوالیوں کو سزا دے، اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

اس آیت پاک سے صاف ہویدا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے، یعنی بخشش و رحمت اس کی صفت ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے، اور اس لیے وہ اپنے کو رحمت الٰہی سے دور کر لیتا ہے، تو یہ خود انسان کا فعل ہے، فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (توبہ : ۹)

اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (مومن : ۴)

اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے،

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ : ۱)

کہ ہر جان کو اپنے ہی کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔

اس لیے بہشت یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس، غرض ہر اچھے بُرے فعل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا تو جسطرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے، اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مر کیوں گئے؟ یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی اسیطرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہمکو انکے اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی، کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے، ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی کتاب مرحمت فرمائی، اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے،

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء : ۲۳)

یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوشخبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنیوالے تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۱)

ہم نے تجھ کو اے پیغمبر، ساری دنیا کیلئے رحمت بنا کر بھیجا۔

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول سے انکار کیا، اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا، اور جس غرض سے خدا نے انکو پیدا کیا تھا، اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا،

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ وَلَوْ شَاۤءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً

اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے برباد کرتا، درانحالیکہ انکے رہنے والے نیکوکار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک

وَاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿١١٨﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ (ھود: ۱۰)

ایک راہ پر کر دیتا، لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا اور وہ یونہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہوا، اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کے لیے بنایا ہے، عذاب کیلئے نہیں لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اسکے عذاب کا سزاوار اپنے کو ٹھہرالیتا ہے، اس آیت کی تفسیر یا حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں، لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ (طبری جلد ۱۲ مصر) خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا عذاب کے لیے نہیں،

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اُس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمان و رحیم جس کا یہ اعلان ہے،

كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ (انعام: ۲) — اس خدا نے (مخلوقات) پر رحمت کو اپنے اوپر واجب کرلیا ہے،

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام: ۶) تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرالیا ہے،

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ۱۹) — اور میری رحمت نے ہر چیز کو سمالیا ہے، اور

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ (کہف ۸) — تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے، اور

وَرَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ (صحیح بخاری) — میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔

وہ اپنے گنہگار و بیکار بندوں سے ہمیشہ کیلئے اپنا منہ موڑلیگا حالانکہ اُسکی رحمت کسی غرض سے نہیں، بلکہ بے غرض ہے، فرمایا،

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ (انعام: ۱۶) — اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے،

اور تسلی دی ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿﴾ (زمر: ۶)

اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو، خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے، بیشک وہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے، اس دنیا میں بھی ہوگا، اور وہاں اس کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر اسکے مقامِ لعنت (دوزخ) سے دوری، اور اسکے مقامِ رحمت (بہشت) سے قرب ہے۔

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (انعام ۲)

جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا یہ تقاضا ہے کہ وہ گنہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل کے بھگت لینے کے بعد آخرکار اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور وہ ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفاخانہ ہے انسان جب عدم حفظِ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو انکے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں، مگر واقعہ نہیں ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو بُرے نتائج انسان کے جسم کے اندر پیدا ہوگئے ہیں، انکو دور کرنے کے لیے جسم جدوجہد کرتا ہے،

اس لڑائی کا نام بیماری اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے جن کو ہم درد سر، درد شکم، اعضا شکنی اور بے خوابی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے جن کو ہم اصطلاح شرعی میں گناہ اور جن کے نتائج بد کو "عذاب" کہتے ہیں یہ نتائج آتش دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے، اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائج بد کو دور کرنے کے لیے جدو جہد میں مصروف ہوگی، وہ آخر عہدہ برآ ہوگی، خدا کی رحمت سے سرفرازی پاکر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کیلئے قید خانہ ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کیلئے شفاخانہ ہے، بیمار کو شفاخانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں، درد، اعضا شکنی، شدت تشنگی، سوزش جسم، وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلائی جاتی ہے، بد مزہ سے بد مزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اسکو نشتر دیا جاتا ہے اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے کوئی داغا جاتا ہے، اور ان سب کی تکلیفیں انکو اٹھانی پڑتی ہیں، مگر یہ ساری ایذا رسانی، کسی انتقام اور تکلیف اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ عدم صحت کی غلط کاریوں کے برے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے، اس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں، وہ گو شفاخانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں، مگر ان کا سبب شفاخانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیتوں اور صحیح حدیثوں سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے، جن میں بالآخر عذاب دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے،

وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ۔ (آل عمران: ۱۴) — اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک خالص کرے، اور کافروں کو مٹائے۔

یہی اصول عذاب آخروی پر صادق آتا ہے، کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہل ایمان کی پاکی و صفائی ہے چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوق عباد کے بعد حَتّٰی اِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا اُذِنَ لَهُمْ فِی دُخُوْلِ الْجَنَّةِ (صحیح بخاری، باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷) یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں گے اور پاک صاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی،

اس حدیث میں یہ دو لفظ هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا ذرا تشریح طلب ہیں، هُذِّبُوْا کا مصدر تہذیب ہے تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لیے چھانٹ دی جائیں تاکہ ان میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو، اور ترقی کی نئی زندگی انکو مل جائے، اور نُقُّوْا کا مصدر تنقیہ ہے، تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لیے کیا درکار ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی۔

طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ، (زمر ۸) — تم پاک و صاف ہو چکے تو جنت میں سدا کے لیے آجاؤ،

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملے گی اسی لیے ہر گنہگار کے لیے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہرحال اس کی انتہا ہے، فرمایا:

لَابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا (نبا: ۱) — دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔

لیکن بالآخران صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا، اور خدا نے چاہا توان کو نجات ملے گی۔

حدیث رویائے برزخ میں ہے کہ آپؐ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنھوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کیے تھے، ان کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت تھا، جب انکی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جاکر پڑجاؤ، سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سپید پانی بہہ رہا تھا، وہ اس میں جاکر پڑگئے پھر نکل کر آئے توان کی وہ بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہوگئے، اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گنہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گنہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود بیماروں کے لیے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہگاروں کی پاکیزگی، اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی، اس رحمان ورحیم کی رحمت وکرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے محروم رکھا جائے، اس لیے ان کی صفائی کے لیے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہوسکیں ان کے لیے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہوجائیں، اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں، اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھیے، جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۥ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ۥ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۥ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۥ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۥ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۥ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۥ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۥ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۥ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۥ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۥ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۥ (رحمٰن ۲)	تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے، پھر کوئی تمہاری مدد نہ کرسکے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، پھر آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہوجائے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس وجن سے اس کے گناہ کی نسبت پوچھا نہ جائے گا، تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے گنہگار اپنی نشانوں سے پہچان لیے جائیں گے، پھر وہ اپنی پیشانی کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے، تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، یہ وہ دوزخ ہے جس کو گنہگار جھٹلاتے تھے، وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے

ان آیتوں کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجیے، یہ بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال، مجرموں کے حق میں نعمت ہیں اس لیے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں، اور اس لیے بھی کہ آخرت میں وہ انہی کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا قائل اور رسولوں کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہگار ہو تاہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب وجلال کا

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر؛

روز ہوگا، جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا ملزم ہونا پڑیگا، مگر بالآخر اس رحمان و رحیم کی شان رحیمی کا ظہور ہوگا اور رَحْمَتِی سَبَقَتْ غَضَبِی، (اور میرے غضب سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کا مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا، اور گنہگاروں کو اسکی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک صاف ہو کر پاکوں کی بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی، فرمایا:

وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ (تغابن:۱)

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، اسے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا، اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِھِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (توبہ:۱۳)

اور دوسرے لوگ جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد، شاید اللہ ان کو معاف کرے، بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اس معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے، دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں، فرمایا:

وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ○ ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْھَا جِثِیًّا ○ (مریم:۵)

اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو تیرے رب کا یہ مقرری فیصلہ ہے، پھر ہم انکو جو خدا سے ڈرے، نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

احادیث صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں۔

۱۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے۔" (صحیح بخاری، کتاب الشفاعۃ)

۲۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دوزخ سے کچھ لوگ اسکی جھلس کھا کر نکلیں گے، اور جنت میں داخل ہوں گے۔" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۳۔ حضرت ابو سعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت والے جنت میں اور دوزخ والے، دوزخ میں داخل ہو چکیں گے، تو خدا فرمائے گا، کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے، پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے، تو وہ اس طرح اُگ آئیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۴۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا، پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا، اور پڑا رہوں گا، تو آواز آئے گی کہ اے محمدؐ! سر اٹھا، مانگ، دیا جائیگا، تو میں سر اٹھاؤں گا، اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا، اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا، تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں انکو دوزخ سے نکالوں گا، اور جنت میں داخل کروں گا، پھر لوٹ آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا، اسی طرح تیسری، پھر چوتھی بار کروں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا، جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۵۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "محمدؐ کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہونگے جن کا نام جہنم والے ہوگا"۔ (ایضاً)

۶۔ حضرت ابوہریرہؓ کے سوال پر آپؐ نے فرمایا کہ میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہو گی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔ (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۷۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا، اور چاہے گا کہ ان کو جنھوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی، دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دیگا، فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدمؑ کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے، تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی، فرشتے جب انکو نکالیں گے تو وہ جلے جلے ہوں گے، پھر ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا، تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۸۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جنت والے جنت، دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو، تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے، پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے، تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیل آب کے کنارے جنگلی دانہ اگتا ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۹۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اہل دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، وہ اسمیں نہ مریں گے نہ جئیں گے، لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی، تو وہ اسمیں کچھ دیر کے لیے مر جائیں گے، یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے، پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی، تو وہ تھوڑے تھوڑے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے، اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ، تو وہ اس طرح اوگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا، وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا، اور اس کو جنت بھری معلوم ہوگی"۔

۱۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے صحیحین میں روایت ہے کہ خدا فرمائیگا کہ "ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی، اور اہل ایمان نے سفارش کی، اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنیوالوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے، یعنی خود وہ رحمان و رحیم، تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔" (صحیحین)

۱۲۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حکم ہوگا کہ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہا ہو اور اس کے دل پر جو برابر بھی نیکی ہو اس کو دوزخ سے باہر کر دو، جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو، اور جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہا ہو اور ذرہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اس

کو آگ سے الگ کرو (ترمذی صفۃ النار حدیث حسن صحیح)

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں، جن کا استقصاء یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (نساء ۱۸:) بیشک اللہ اسکو معاف نہ کریگا کہ اس کیساتھ شرک کیا جائے اور اسکے سوا جو گناہ ہے وہ اسکو جس کیلیے چاہیگا معاف کردے گا۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجے سے برأت کی جا سکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، اس لیے ان کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانونِ ازلی کے خلاف ہے۔

شرک وکفر کی بخشایش نہیں احکام الٰہی اور شریعت ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے جو بمنزلہ اصل کے ہے، اس کو مذہب کی زبان سے ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم، اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں، اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جسکا تعلق اعضاء اور جوارح سے ہے، اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک وکفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان و عمل و عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ میں روشنی کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے، مگر جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اسکی روشنی سے ہمیشہ کے لیے نا امیدی ہے، اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں، اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے، اعمالِ خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمالِ شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے، جن کی تلافی عذاب دوزخ کے بعد یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے، اور نجات مل سکتی ہے، ایمان و علم و عرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے، اسکا حصول ہوت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں، ہماری سعت کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا، اس بنا پر شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے، کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے، اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اسلیے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحمدل سے رحمدل ممتحن کیلیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اسکو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں، اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے، تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان و علم و عرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے اپنے ناقابل تلافی نتیجے کے بھگتے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک وکفر کے گنہگاروں کے لیے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟ دوزخ جو عقاب الٰہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے، ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدتِ دراز کے بعد ایک دن جب جہنم کی آگ

---

(۱) دیکھئے حاشیہ صفحہ ۳۰۰ پر

رحمتِ الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہوجائے گی، حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے۔" اسی کیساتھ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا، اسی وقت اس نے اپنے عرش کے اوپر لکھدیا کہ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي (میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی۔

اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے، اس کی جنت ہی کی طرح دائمی وابدی ہو تو اسکا غضب اسکی رحمت پر سبقت لیجاتا ہے، یا برابر ہوجاتا ہے، اور اس کا تخیل بھی اس رحمان ورحیم کی نسبت نہیں ہوسکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا، اور ننانوے حصے قیامت کے دن کے لیے رکھے ہیں، اسلیے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا، جب اسکے غضب پر اسکی رحمت غالب آئے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا اور یہ وہ دن ہوگا جب گنہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہوکر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بنیں گے۔

اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک وکافر ہیں، جو اسوقت تک نجات نہ پاسکیں گے، جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے، تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت بھی قرآن میں حسب ذیل تصریحات ہیں،

۱۔ لَٰبِثِينَ فِيهَآ أَحْقَابًا (نباء: ۱) وہ دوزخ میں صدہا ہزار سال ٹھہریں گے۔

صدہا ہزار سال کی مدت کس قدر بڑی ہے، پھر بھی ایک دن اس کا خاتمہ ہوگا، دوسری آیت جو صریحًا کفار ومشرکین کے حق میں ہے یہ ہے:

۲۔ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ (انعام: ۱۵) دوزخ ہے تمہارا ٹھکانہ، اسمیں تم سدا رہنے والے ہو، لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بیشک تیرا رب حکیم وعلیم ہے۔

(بقیہ حاشیہ) ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہوچکے ہیں، جن کی تفصیل ملل ونحل کی کتابوں میں موجود ہے، ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہہ قطعیت کیساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی وابدی ہے، لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے، عام اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا وجود دائمی وابدی ہے، گنہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھاکر یا خدا کی رحمت سے معاف ہوکر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے لیکن مشرک وکافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہونگے، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے، فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہوگا وہ گنہگار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائیگا، بلکہ معافی سے سرفراز ہوکر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا، اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیگا، اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابۂ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں، اور متاخرین میں جس کے پُرجوش حامی حافظ ابن قیم ہیں، یہ خیال ہے کہ جب گنہگار اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پاچکیں گے، تو جہنم فنا کردی جائے گی، حافظ ابن قیمؒ نے اپنی دونوں کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح (دونوں مطبوعہ ہیں، حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے) میں قرآن، احادیث، آثار صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے (دیکھو شفاء العلیل، (ص ۲۵۲ تا ص ۲۶۴) جیسیہ مصر اور حادی الارواح از ص ۱۶۷ تا ۲۳۵ جلد دوم مطبوعہ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا خیال

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے، مگر اس کی رحمت کا اقتضاء کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم و علیم ہے، اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے، اور کب کرنا چاہیے،

تیسری آیت میں ہے:۔

۳۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔ (ھود:۹)

وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے، بیشک تیرا رب جو چاہتا ہے، وہ کرتا ہے۔

دوسری اور تیسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو "رب" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیئت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ربوبیت، کا اقتضاء ہے، قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام، عدم انتہا اور تسلسل بجوہر بتصریح استدلال کیا جا سکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی و بقا اور عدم انقطاع و عدم فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں، چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام و کمال یہاں نقل کرتے ہیں۔ فرمایا،

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ (ھود:۹)

تو لیکن جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے، اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور دھکیلنا ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرا رب، بیشک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں ہوں گے، ہمیشہ اس میں رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔

دیکھو کہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لیے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیئت سے استثناء فرمایا، مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ "مگر جو چاہے تیرا رب، بیشک تیرا رب جو چاہے

تسلیم کیا ہے، حادی الارواح ابن قیم جلد دوم ص ۱۶۷)، ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے، العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الاباء والمشائخ ص ۱۲۲)، صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے، وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ انکو اسی دوزخ میں راحت و لذت معلوم ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں، اور ان ہی میں لطف اٹھاتے ہیں، یہیں تک اس خاکسار نے بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمال الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے، اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، اور توبہ کی توفیق بخشے، اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھول دے (بقیہ ص ۴۰) ۱؎ صحیح بخاری باب رحمۃ اللہ، جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم ۲؎ صحیح بخاری باب وَلَقَدْ سَبَقَتْ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ ۳؎ صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ

کر ڈالتا ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے، اور چاہے تو قائم رکھے، لیکن اہلِ جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا "مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔" اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے، اس آیت کی تفسیر میں متعدد آئمہ سلف، مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے لیکن اہلِ دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے[1]۔

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لیکر اس طرح فرمایا گیا ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۞ (بینہ)

بیشک اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں، بیشک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وہ بہترین لوگ ہیں ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہوں۔ وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے،

غور سے دیکھو کہ اس میں اہلِ دوزخ کے مقابلہ میں اہلِ جنت کے دوام کی نسبت کتنی تاکید پر تاکید ہے، پہلے عدن فرمایا جسکے معنی "قیام" اور "بسنے" کے ہیں پھر خالدین کہا کہ وہ اسمیں رہا کریں گے، بعد ازیں "ابدا" فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے:

وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۞ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۞ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۞ (تغابن: ۱)

اور اس کو ان باغوں میں داخل کریگا، جنکے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے، اور جنہوں نے انکار کیا، اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے، اور وہ بری جگہ ہے۔

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور خالدین فیہا ابداً (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے، کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کی تعیین سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرمادی گئی ہے، مثلاً

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۞ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞ (آل عمران: ۱۱)

جس دن کچھ منہ سپید ہونگے، اور کچھ سیاہ، تو جو سیاہ ہوئے تو کیا ایمان کے بعد کافر ہوگئے تھے، تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو، اور جن کے منہ سفید ہوں ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔

---

[1] تفسیر طبری درمنثور سیوطی، تفسیر آیات ہود، رکوع ۹ و انعام رکوع ۱۵۔

آیت بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے، اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تام ہے، ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابۂ کرام سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئیگا، جب دوزخ کے میدان میں ہو کا عالم ہوگا، اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئیگا، چنانچہ:۔

۱۔ طبرانی میں حضرت ابوامامہ صحابی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئیگا جب خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائیگا، اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

۲۔ حضرت جابرؓ یا کسی اور صحابیؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئیگا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے، اور اسمیں کوئی نہ ہوگا"

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم میں ایک دن ایسا آئیگا جب اسمیں کوئی نہ ہوگا،

۴۔ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر اہل دوزخ ریگستان عالج کے ذرات کے شمار کے بقدر بھی دوزخ میں رہیں، پھر بھی ایک دن آئیگا، جب وہ اس سے نکلیں گے۔"

۵۔ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ جہنم پر ایک دن آئیگا جب اس کے خالی دروازے بھڑبھڑائیں گے، اور اسمیں کوئی نہ ہوگا اور یہ اسوقت ہوگا جب لوگ اس میں صد ہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کر لیں گے۔"

۶۔ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ صحابی یا ابوسعیدؓ خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے فرمایا کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کا استثناء پورے قرآن پر حاوی ہے، یعنی جہاں جہاں قرآن میں خَالِدِيْنَ فِيْهَا (سدا اسمیں رہیں گے) ہے، وہاں مشیت الٰہی کا استثناء قائم ہے۔

۷۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئیگا جب اسکے خالی دروازے کھڑکھڑائیں گے۔[1]

دفع شبہہ | قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ہمیشہ کے لیے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے،

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكَافِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا، خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ج (احزاب: ۸)

۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

۲۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، (جن: ۲)

۲۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا،

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا لا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط (نساء: ۲۳)

۳۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا، اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھلائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں،

ان تینوں آیتوں میں خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جنکے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت تک دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک جب مشیت الٰہی

[1] حافظ ابن قیم نے شفاء العلیل (ص ۲۵۸) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب تفسیر و حدیث سے نقل کیا ہے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا،

باقی چند آیتوں میں اَبَدًا (ہمیشہ) کے بغیر صرف خَالِدًا ہے، جیسے هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (وہ اس میں خالد رہیں گے) یا ایک جگہ ہے:-

وَ ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (سجدہ:۲) اور "خلود" کے عذاب کا مزہ چکھو"

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لیے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانۂ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا خالدین کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو، جو دوام کے معنی کی تخصیص کردے، جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے، جہاں اہل جنت کو خٰلِدِین کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں، اس لیے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف خٰلِدِیْن بھی ہے، وہ ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لیے جائیں گے۔ برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خلدین کا لفظ ہے، وہاں دوام کے مفہوم کیلئے کوئی قرینہ موجود نہیں، اس لیے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار زمانۂ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گنہگار اہل ایمان کی سزا میں کبھی خالدین کے ساتھ ابداً استعمال نہیں کیا گیا ہے، گنہگار اہل ایمان میں سب سے بڑی دھمکی اسکو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو، مگر اسکے لیے بھی خالدین کیساتھ ابدًا استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا، وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا (نساء:۱۳) اور جو کوئی کسی باایمان کو قصداً قتل کرے گا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، جس میں وہ خالداً (یعنی مدت دراز تک پڑا) رہے گا۔

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہل اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشائش کے قائل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں خلود سے مراد "ہمیشگی" نہیں ہے، بلکہ زمانۂ دراز ہے کہ اہل توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے، اور اس لیے مومن کے لیے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہو سکتا، بنابریں ان آیتوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں، بلکہ عرفی دوام، یعنی مدت دراز کے ہیں ہم عام طور سے مجرم کے لیے "حبس دوام" کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد ابد تک کیا قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ عمر بھر بھی نہیں، بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی دراز ترین مدت مراد ہے، جسکا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے، کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں، اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفو عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں، جن میں مذکور ہے کہ گنہگار دوزخ سے الگ نہ ہونگے، چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:-

۱- اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۚ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۱۔ بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں، وہ انصاف کے دن اس میں

(بقیہ حاشیہ) ان میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورۂ ہود جلد ۱۲ ص ۶۶ میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر درمنثور تفسیر سورۂ ہود جلد ثالث ص ۳۵۰ میں زیر آیت مذکورہ ہود میں ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی (ص ۱۲۳) مطبوعہ حیدر آباد میں چھٹی روایت ہے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝ (انفطار: ۱)

۲- وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ (بقرہ: ۲۰)

۳- إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ (مائدہ: ۶)

۴- كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ (حج: ۲)

۵- وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝ (سجدہ: ۲)

داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔

۲۔ اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ایسے ہی الگ ہو جاتے جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا، اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں،

۳۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا، اگر اُن کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو، اور اتنا ہی اور ہو تاکہ اس کو فدیہ دیکر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں تو وہ اُن کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اُس سے نکلنے والے نہیں، اور ان کیلئے قائم عذاب ہے۔

۴۔ جب وہ چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں تو اسمیں لوٹا دیے جائیں گے، اور کہا جائیگا کہ جلنے کی سزا چکھو،

۵۔ اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی، تو اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں، اسمیں لوٹا دیے جائیں گے، اور کہا جائیگا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے،

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں، جن سے بعضوں کو عذاب دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائیگی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گنہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائیگا، تو یہ محال ہے، کہ عذاب سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکال کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے، تو اب کی ہم نیکی کا کام کریں گے اس کے جواب میں کہا جائیگا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دیکر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جا سکتی، اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائیگا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے اور مدتِ عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں، مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی، اور نہ اسکی کہ بقدر گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی، اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے،

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گنہگاروں کے لیے دوام عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے مگر ایک ایک آیت کو غور سے

پڑھ کر ان میں کسی میں بھی دوزخ کے دوام بقا اور عدم فنا یا اس کے عذاب کے عدم انتہا کی تصریح ہے،
حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گنہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا یقیناً برائی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمام تر پاک ہے کہ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ (آل عمران: ۲۰) تو وہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا (مریم: ۳) اس کا وعدہ جنت پورا ہی ہوگا، لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہدید سابق برائی کیساتھ نہ دیا جائے، تو حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابل ملامت ہو بلکہ اسکا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے، جس کا اہل اس رحمان و رحیم اور عفو و غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں، اس لیے گنہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے، چنانچہ مسند ابو یعلیٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا، لیکن جس کسی کو اس کے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے، تو اس کو اختیار حاصل ہے[1]۔"

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک صاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات و کنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا، کیونکہ اس سے ان میں ندامت اور توبہ کے رجحان کے بجائے خودسری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان میں آئندہ کے نتائج بد سے نڈرپن اور بے خوفی آجاتی اور ایسا نہ ہونا تنبیہ و صلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا، اس لیے ان کا قانونی سزا تو اللہ تعالیٰ نے دائمی عقاب مقرر فرمائی، لیکن آخرکار انکی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر، انکو ایک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا، اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعۃً معاف ہو جاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا، اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں، خدا چاہے بھی تو معاف نہیں ہو سکتے، اسلام نے آکر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کر دیا، ایک طرف فرمایا كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ، ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے، (مدثر: ۲۱) اور دوسری طرف فرمایا يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ، خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے (مائدہ) یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت

[1] بحوالہ شفاء العلیل ابن قیم ص ۲۲۲، مصر۔

اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے جسطرح اس دنیا کا حال ہے کہ اگر خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں، جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں، مگر بایںہمہ اس کا حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے، اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچایا، اور دوسری طرف خدا کی قدرتِ تام اور رحمتِ عام کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے، پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا، سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزار ہا سال کے عقاب کے دینا مناسب نہیں حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ انکی تسکین کے لیے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پا جاتا ہے، چوری، عمل خلاف قانون، یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے ؟ مگر اسکے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں، اور اس کو خلافِ عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں، مہینوں، بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں جاکر کہیں اُن چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے، اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اُس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے، اور آخر میں جان دیدیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گناہ زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے، اس کی تلافی کی مدت، غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت، اور خلاقِ عالم کی مصلحت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے، اسی لیے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لیے یکساں نہیں ہو سکتی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَةِ الْحَالِ،

مشرک و کافر کا آخری انجام اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی، تو کیا اہل کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم و کرم کے سزاوار ہو جائیں گے ؟ جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے، اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک و کفر کی جزاء، دوام عذاب اور خلود نار خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا، ہے یعنی جب تک دوزخ قائم ہے، اس سے انکو نجات نہیں مل سکتی، مگر جب حسب مشیتِ الٰہی وہ دن آئے کہ دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:۔

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ۝ (انعام: ۱۵)	فرمائیگا، دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اسمیں ہمیشہ رہو گے، مگر یہ کہ جو چاہے اللہ بیشک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے غور کے قابل ہے، فرمایا "تیرا رب حکمت اور علم والا ہے" اس موقع پر خدا کے لیے خاص طور سے رَبّ کا لفظ لانا، یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی، اور اسکے غیر محدود علم و

حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پران کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰ کی زبان سے قرآن پاک میں یہ تصریح الٰہی ہے:

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ (مائدہ: ۱۰)

یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

نیز ایک اور آیت میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ (اعراف: ۵)

بیشک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، اور انکے ماننے سے غرور کیا تو انکے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہونگے تاآنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانونِ جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو دوزخ کے عذاب کا خاتمہ ہو جائے پر بھی جنت کے حاطہ میں انکا گذر نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دائرہ بہت وسیع ہے، جیسا کہ خود اس نے اہلِ دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝ (ہود: ۹) وہ دوزخ میں رہینگے، لیکن تیرا رب جو چاہے، بیشک تیرا رب جو چاہے کر گذرتا ہے۔

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے، کیونکہ اپنی رحمت کی وسعت کی نسبت اسکا اعلان یہ ہے:

رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ (اعراف: ۱۹)

اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لیے ہے،

اس رحمتِ عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کی نسبت خدا فرماتا ہے:-

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ۝ (انعام: ۱۸)

تو (اے پیغمبر!) اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہدے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب گنہگاروں سے لوٹایا نہیں جا سکتا۔

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے، لیکن خود اسکی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو انکو دنیا ہی میں ہدایت دیکر جنت نصیب کرے، یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کر دے، اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے، جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا:

مَّن يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ (انعام: ۲)

جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا تو خدا نے اس پر رحم کیا،

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مومن کو معلوم ہو، کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے، اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو، مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے:

بہ تہدید اگر برکشد تیغِ حکم	بمانند کرّوبیاں صم و بکم
وگر در دہد یک صلائے کرم	عزازیل گوید نصیبے برم

خود اس رحمان و رحیم کا جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے، یہ ارشاد ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے:-

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ o (مائدہ ۳:)

جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے، اور آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی اللہ کے لیے ہے، اور اسکی طرف لوٹ کر جانا ہے،

لیکن اس کی یہ مشیئت جیسا کہ اس نے (انعام رکوع ۱۵) میں فرمایا ہے، اسکی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے، مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت و حکمت کا تقاضا ہوتا ہے،

اس سے زیادہ اس بات میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدا نے تعالیٰ نے فرمائی اسکی تفریح کا حق کسی کو کیا ہے؟ اسلیے مشرک کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیئت الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:۔

اَلنَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ o (انعام ۱۵:)

دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اسمیں سدا رہو گے، لیکن جو چاہے اللہ بیشک تیرا پروردگار حکمت والا، اور علم والا ہے۔

جمہور کا مسلک یہ جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہیگا، اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہونگے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی،

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو گنہگار تھے مگر دل میں ایمان رکھتے تھے ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشائش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے انکی گنہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے یہ وہ زمین شور ہوں گے جنمیں اس رحمتِ عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

رحمتِ عمومی کے معتقدین گذشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور اس کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے، اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں:۔

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا o (احزاب ۸:)

۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کیلئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں

۲۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا o (جن ۲:)

۲۔ اور جو اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کریگا، تو اس کیلئے جہنم کی آگ ہے، وہ اسمیں ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا o (نساء ۲۳:)

۳۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھلائے لیکن جہنم کی راہ، اس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوگا، اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہیگی،

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کفار سے کبھی دور نہ ہوگا:

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ اَنَّ لَہُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا وَّ مِثۡلَہٗ مَعَہٗ لِیَفۡتَدُوۡا بِہٖ مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَا تُقُبِّلَ مِنۡہُمۡ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿﴾ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنَ النَّارِ وَ مَا ہُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنۡہَا ۫ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ ﴿﴾ (مائدہ ۶:۵)

۱۔ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر بالفرض ان کے پاس ساری دنیا کا خزانہ ہو اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تاکہ وہ اس کو فدیہ دیکر قیامت کے دن کے عذاب سے چھوٹ جائیں، تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے، اور ان کے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

۲۔ وَ مَا ہُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنَ النَّارِ ﴿﴾ (بقرہ ۲۰:۱۵)

۲۔ وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے،

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا:-

۳۔ فَالۡیَوۡمَ لَا یُخۡرَجُوۡنَ مِنۡہَا وَ لَا ہُمۡ یُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ﴿﴾ (جاثیہ ۴:۳)

۳۔ تو آج اس (دوزخ) سے وہ نہیں نکالے جائیں گے، اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔

۴۔ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابٍ مُّقِیۡمٍ ﴿﴾ (شوریٰ ۵:۱)

۴۔ ہاں کافر و مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہونگے۔

ظلم کا اطلاق قرآن مجید میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہل شرک کا عذاب قائم رہیگا۔

۵۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ لَعۡنَۃُ اللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿﴾ (بقرہ ۱۹:۲)

۵۔ بیشک جنھوں نے کفر کیا، اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے۔ اسمیں وہ سدا رہیں گے، انکے عذاب میں کمی نہیں کی جائیگی، اور نہ انکو مہلت دی جائے گی،

۶۔ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَہُمۡ نَارُ جَہَنَّمَ ۚ لَا یُقۡضٰی عَلَیۡہِمۡ فَیَمُوۡتُوۡا وَ لَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمۡ مِّنۡ عَذَابِہَا (فاطر ۴:۳)

۶۔ اور ان کے لیے جنھوں نے کفر کیا جہنم کی آگ ہے نہ تو انکا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔

شرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا:-

۷۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ (نساء ۱۸:۱)

۷۔ بیشک اللہ اسکو معاف نہ کریگا کہ اسکے ساتھ شرک کیا جائے۔

۸۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ثُمَّ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَہُمۡ ﴿﴾ (محمد ۴:۱)

۸۔ بے شبہ جنھوں نے کفر کیا، اور خدا کے راستے سے روکا، اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے، تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائیگا،

ان کے لیے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے:

۹۔ اِنَّہٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ وَ مَاۡوٰىہُ النَّارُ ؕ (مائدہ ۱۰:۵)

۹۔ یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے،

۱۰۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ اسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡہَا لَا تُفَتَّحُ لَہُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا یَدۡخُلُوۡنَ

۱۰۔ بیشک جنھوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور انکے ماننے سے سرکشی کی، ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے،

الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف ۱۱) اور جنت میں داخل ہونگے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں گھس جائے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ، اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (آل عمران: ۱۸)

۱۱۔ اور (اے پیغمبر) تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، غم میں نہ ڈالیں۔ وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے خدا چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی، ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا، اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی، اور نہ ان کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رُخ آپ کے سامنے آگئے؛

بیا کیں داور بہارا بہ پیش داور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے اور برعالم برزخ کے ذکر میں ہم بتفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمام تر تمثیلی ہوگی، اس تمثیلی کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب و مشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ یعنی اپنے مال کا میل کچیل مستحقین کو کھانے کے لیے نہ دیگا تو اس کو دوزخ میں زخموں کی دھوون کھانے کو ملیگا، یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دیگا مرنے کے بعد اس کو جانِ تازہ اور حیاتِ نو بخشی جائے گی، وہ دولتمند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے قصر و محل اور پینے کے لیے ٹھنڈے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی، اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا، تو دوسری دنیا میں اس کو یہ سامان ملے گا،

فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ (واقعہ ۲)

وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا، نہ باعزت، بیشک وہ پہلے ناز و نعمت میں تھے۔

رویائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا، یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور برے تھے، اس لیے بداعمالی بدصورتی، اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا، تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجتمند ہو کر ننگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا۔

(ترمذی کتاب الزہد والرقاق ص ۳۴۳)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کریگا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائے گا اور جو کوئی کسی

لہ حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے۔

نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کریگا، تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کریگا، اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا، خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا (ترمذی صفحہ ۳۲۳)

۳۔ جو انسانوں پر رحم کرے گا، خدا اس پر رحم فرمائے گا، (ترمذی)

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں، وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے، مثلاً

۱۔ قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، دیکھو کہ دنیا کی معنوی قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری، جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

۲۔ حدیث میں ہے کہ اہل تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے، جن پر ہر طرف سے ذلت خواری چھائی پھرتی ہے گی، دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت و خواری سے ملے گی، اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں اس لیے ان کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

۳۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ جو بخل کرے گا، قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے گا[۲] صفتِ بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کرکے اسکی تکلیف کا باعث ہوگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص بلا وجہ بھیک مانگ کر اپنی آبرو ریزی کرتا ہے، قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا، دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی، اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہو کر) جھک گیا ہوگا[۳]، ایک پہلو کا عدم ادائے حق اپنی تمثیلی صورت میں ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا، یہ چند حوالے ذکر کیے گئے ہیں، انہی پر جزاء و سزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہیے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے:۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ○ قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ج وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَى ○ (طٰہٰ:۱)

جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گذران ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دیکھتا تھا فرمائے گا، اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھولا جائے گا،

دیکھو کہ دل کی نابینائی، قیامت میں ظاہری نابینائی، اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمتِ الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا،

دوزخ کی جسمانی سزائیں

دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی

[۱] ترمذی کتاب الزہد والرقائق صفحہ ۲۱ [۲] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں مثل لہ مالہ شجاعا اقرع [۳] ترمذی

سزاؤں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں :-

۱۔ آتش دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے، بلکہ اَلنَّار یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے؛ ان ہی معنوں میں اَلسَّعِیْر یعنی جلتی آگ بھی بارہا استعمال ہوا ہے، اور عَذَابُ الْحَرِیْقِ (جلن کا عذاب) بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے، اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كَالِحُوْنَ ۝ (مومنون: ۶)

ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی اور اُن کی صورتیں اس میں بگڑ جائیں گی،

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ (مدثر: ۱)

اور تمہیں کیا معلوم سقر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائے گی، نہ چھوڑے گی، چہروں کو جھلس دینے والی.

كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ (معارج: ۱)

ہرگز نہیں وہ شعلہ والی آگ ہے، منہ کی کھال ادھیڑنے والی

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝ (مرسلات: ۱)

دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ.

۲۔ وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ یہ حکم ہوگا؛

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۝ (مرسلات: ۱)

چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی، نہ گھن کی چھاؤں، اور نہ تپش میں کام آسکے.

۳۔ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی:

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝ (نباء: ۱)

اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا.

۴۔ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے، اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دو جگہ فرمایا:

لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (طٰہٰ و اعلیٰ)

وہاں وہ نہ مرے گا نہ جیے گا،

۵۔ پینے کو گرم پانی ملے گا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی،

وَسُقُوْا مَاۗءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَاۗءَهُمْ ۝ (محمد: ۲)

اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی اُن کی آنتوں کو ٹکڑے کر دے گا.

۶۔ اور پیپ پئیں گے:

اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۝ (نباء: ۱)

لیکن کھولتا پانی اور پیپ،

۷۔ اُن کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا،

يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ (حج: ۲)

ان کے سروں کے اوپر گرم پانی ڈالا جائے گا.

۸۔ کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا،

أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ٥ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ٥ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ٥ فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ٥ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ ٥ (والصّٰفّٰت: ۲)

یا سینڈھے کا پھل ..... وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں اُس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے، اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ٥ طَعَامُ الْأَثِيمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ٥ (دخان: ۳)

سینڈھے کا درخت گنہگار کی غذا ہے، جیسے پگھلا ہوا تانبا، وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے کھولتا پانی،

۹۔ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی، جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا:

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ٥ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ٥ (غاشیہ: ۱)

اور اُن کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا، لیکن خاردار جھاڑی جو نہ موٹا کریگی، اور نہ بھوک سے بے پرواہ کرے گی۔

۱۰۔ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی،

وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ٥ (حاقہ: ۲)

اور نہ کوئی کھانا، مگر زخموں کا دھوون،

۱۱۔ کھانا نگلا نہ جائے گا:

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (مزمل: ۱)

اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔

۱۲۔ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا،

فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِنْ نَارٍ ٥ (حج: ۲)

کافروں کے لیے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔

۱۳۔ لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے:

وَلَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ ٥ (حج: ۲)

اور ان کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔

۱۴۔ گلے میں طوق اور زنجیریں:

إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ٥ (مومن: ۸)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ کھینچے جائیں گے۔

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلَا وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا ٥ (دہر: ۱)

ہم (خدا) نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار رکھی ہے۔

مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ٥ (ابراہیم: ۷)

وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔

دوزخ میں روحانی سزائیں ان جسمانی سزاؤں کیساتھ روحانی سزائیں بھی ہونگی، جو اہل نظر کی نگاہ میں اُن سے بھی بڑھ کر ہیں، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گذر چکا وہ دل کو جاکر جھانکے گی فرمایا:

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (ہمزہ:۱) سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی ،

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ط (یونس:۶) اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے ۔

يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِىْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (زمر:۶) اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی ۔

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ (حج:۲) وہ جب جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں ۔

ذلت کا عذاب :

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ (احقاف:۲) تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیے جاؤ گے ۔

اس افسوس حسرت وندامت سے بڑھ کر یہ کہ اُن کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی ،

لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ط (تحریم:۶) آج معذرت نہ پیش کرو ،

اللہ عزوجل کے مکالمہ کا شرف اُن کو نہ ملے گا ، جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائیگا ؛

اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ٥ (مومنون:۶) ذلیل ہو اس دوزخ میں ، اور مجھ سے بات نہ کرو ،

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے ،

كَلَّا ط اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ٥ (تطفیف:۱) ہرگز نہیں ، وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے ،

اُن میں سے جنھوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا ، اُس دن وہ بھی اُن کو اپنی رحمت وشفقت کی یاد سے بھلا دے گا ، فرمایا :

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ج وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ٥ (طٰہٰ:۷) اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے اُن کو بھلا دیا ، ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائے گا ۔

ایسے دوزخی بھی ہونگے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے ، وہ اُنکی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے گا نہ اُن سے کچھ بات کریگا ، اور نہ اُن کی اصلاح حال کی کوئی فکر کریگا ، یہ حقیقت میں شفیق ومہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے ، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق ومحبت کے زخم خوردہ ہیں ، فرمایا :

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ص وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ٥ (اٰل عمران:۸) جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خریدا کرتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ، نہ قیامت میں خدا ان سے بات کریگا ، نہ اُنکی طرف دیکھے گا ، نہ اُن کو سنوارے گا ، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ،

—— ۱۱ ——

جنّت

جنت کے نام اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً اَلْجَنَّۃُ (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے، مثلاً جَنَّۃُ النَّعِیْمِ (نعمت کا باغ) جَنَّۃُ الْخُلْدِ (بقائے دوام کا باغ) جَنّٰتُ عَدْنٍ (دائمی سکونت کے باغ) جَنَّۃُ الْمَاْوٰی (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے، مثلاً فِرْدَوْسٌ (باغ) رَوْضَۃٌ (چمن) دَارُ الْخُلْدِ (ہمیشگی کا گھر) دَارُ الْمُقَامَۃِ (قیام کا گھر) دَارُ السَّلَامِ (امن و سلامتی کا گھر)

جنت کا دوام اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں، مگر جو چیز یہاں نہیں ہے، وہ بقائے دوام ہے، یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت آنی ہے، یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں، جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کیساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے، انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے، اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے، مگر الم نہیں، مسرت ہے، مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں، اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن و اندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جنت کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا، اس نے کہا اے آدمؑ!

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۔ (طٰہٰ:۷) — کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتا دوں جس کو فنا نہیں۔

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا، وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی، جو ان کے حق میں زہر تھی، یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق ان کے اور انکی نسل کے اعمال صالحہ کا صلہ قرار پایا، چنانچہ فرمایا،

اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ۔ (فرقان:۲) — یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا، جو ان کا صلہ ہوگا، اور واپسی کی جگہ،

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے، جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ

آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا:

(۱) وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ۝ (نساء: ۱۸)

اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ کے لیے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔

اس تاکید پر تاکید اور پر زور طریقۂ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف "خلود" پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہی "اَبَدًا" فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا، "کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے"، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے۔

۲. وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۭ (نساء: ۸)

۲. اور جو ایمان لائے، اور اچھے عمل کیے ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،

۳. لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۝ (مائدہ: ۱۶)

۳. ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے

۴. وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۭ (توبہ: ۳)

۴. اور اللہ انکو خوشخبری دیتا ہے کہ انکے لیے وہ باغ ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے، اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۵. وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۭ (توبہ: ۱۳)

اور ان کے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اور ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۶. وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۝ (تغابن: ۱)

۶. اس کو ان باغوں میں داخل کریگا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،

۷. وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝ (طلاق: ۲)

۷. اور جو اللہ پر ایمان لائے، اور نیک کام کریں اس کو وہ ان باغوں میں داخل کریگا جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔

۸. جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۭ (بینہ: ۱)

۸. انکی مزدوری انکے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہل جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے، انکے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا:

۹. وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ

۹. اور ان مومنوں کو بشارت دیگا جنھوں نے اچھے کام کیے، کہ ان کے لیے اچھا

لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا ۝ (کہف: ۱) مزدوری ہے جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے۔

سورہ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے ذکر کے بعد ہے:

۱۰- هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِن نَّفَادٍ ۝ (ص: ۶) یہ وہ ہے جسکا حساب کے دن تم کو دیئے جانے کا وعدہ کیا جاتا ہے بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔

۱۱- وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ۝ (ھود: ۹) ۱۱- اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں، لیکن جو تیرا رب چاہے، وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔

یعنی خدا کی مشیئت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا، لیکن اس کی مشیئت یہی ہوگی کہ ان کیلئے اسکی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے پھر جسکے متعلق اسکی مشیئت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہو سکیگی۔

۱۲- وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ۝ (توبہ: ۳) ۱۲- اور وہ باغ جن میں ان کیلئے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔

۱۳- أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا ۚ (رعد: ۵) ۱۳- جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔

۱۴- وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ۝ (واقعہ) اور بہت سے میوے جنکا نہ انقطاع ہوگا، اور نہ جن کی روک ہوگی۔

۱۵- إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ (والتین: ۱) ۱۵- لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے وہ مزدوری ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے، اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کردی گئی کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو خَالِدِينَ أَبَدًا کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جاچکی ہے مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہدیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گذر نہ ہوگا، فرمایا:

۱۶- لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ (دخان: ۳) ۱۶- جنت میں جانیوالے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔

لیکن اب ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائم ہو، مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے، تو اسکی تصریح بھی فرمادی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہل جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا:

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُم مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ۝ (حجر: ۴) وہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا، اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانۂ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے، فرمایا:

خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ (کہف: ۱۲) سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل نہ ہونا چاہیں گے۔

دوام و بقا اور تسلسل و عدم و انقطاع کی اس تو بر تو تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسباب مسرت کی بقا، راحت کا دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (طٰہٰ ۔ ۷) اور غیر فانی سلطنت، کہکر آدمؑ کو دلائی تھی، اور اس بہانہ سے اس عالم بقا سے انکو اس عالم فنا میں بھجوا دیا، آخر زمانہ آئیگا، جب آدمؑ کی اولاد کو انکے نیک اعمال کے بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لیے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی دنیا میں شخصی راحت و آلام کا بلند سے بلند تخیل، ایک لفظ بادشاہی کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے، اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوشخبری دینے کے لیے کوئی لفظ ہو سکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے، جسمیں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامان راحت اور اسباب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو، اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زریں کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے نئے مزے اور بلوریں پیالے، جبیں و مہ جبیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔

جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدمؑ کے دشمن نے آدمؑ کے سامنے کی تھی۔

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (طٰہٰ ۔ ۷) اور غیر فانی بادشاہی۔

آنیوالی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیے، مختلف پیغمبروں نے مختلف لفظ استعمال کیے ہیں چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی، اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور مادیت کے ماحول میں پھولے پھلے ہیں، کسی روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو ان ہی لوازم اور خیالات کیساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کیساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہکر کسی قدر مادہ سے بلند کریں مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہو سکتے، چنانچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ [illegible] دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"میں تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیونگا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیوں" (متی ۲۶-۲۹)

آپ نے دیکھا کہ "باپ" کی "آسمانی بادشاہی" میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا۔

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ ان کو اسی سونے چاندی کے محل، آب حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی (مکاشفات یوحنا باب ۲۲-۲)

"وہاں رات نہ ہوگی، اور وے چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں، کیونکہ خداوند خدا ان کو روشن کرتا ہے، اور وے ابد الآباد بادشاہی کریں گے" (۲۲-۵)

لیکن یہ بادشاہی عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے،

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچا لیا، اور انکو

وَسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَاۗىِٕكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۝ قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاۗءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (دہر:۱)

تروتازگی اور شادمانی سے ملایا اور انکے صبر کے بدلے میں ان کو رہنے کے لیے، باغ اور پہننے کیلئے ریشمی کپڑے دیئے، وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے، ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈک اور ان کے سائے ان پر جھکے ہوں گے، ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہوں گے، چاندی کے برتن اور نقرئی شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں، انکو لوگ ان کے پاس لیے پھریں گے، اور انکو وہاں وہ پیالہ پلایا جائیگا، جسمیں سونٹھ ملی ہوگی، اسمیں ایک چشمہ کا نام سلسبیل ہے، اور سدا رہنے والے کمسن غلام انکی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے، تو انہیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھر رہے ہیں، اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت و عیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، انکی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو، اور انکو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے، اور ان کا پروردگار انکو پاک شراب پلائے گا، یہ تمہاری مزدوری ہوگی، اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی،

یہ پورا نقشہ اس عیش و مسرت کا ہے، جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آسکتا ہے، اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہؓ صحابی سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰؑ نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار جنت والوں میں سب سے کم رتبہ کون ہوگا، فرمایا وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئیگا تو اس سے کہا جائیگا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جاچکے، اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے، اس سے کہا جائیگا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس تھا، عرض کریگا خداوندا میں راضی ہوں" فرمائے گا" تیرے لیے اتنا اور اس سے دونا، اور اس سے تگنا اور چوگنا ہے، کہے گا، خداوندا میں راضی ہوگیا: خدا فرمائیگا، تیرے لیے وہ اور اس کا دوگنا ہے، عرض کریگا میں راضی ہوگیا' فرمائیگا، اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے، اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے[1]۔

باغ کا استعارہ آخرت کے خانۂ عیش و راحت کیلئے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے، اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے، مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اسلیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے، انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات باغ و بہار، اور کنار آب نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور انکو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

---

[1] جامع ترمذی، تفسیر سورہ سجدہ، (حدیث حسن صحیح)

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے، انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوئی ہیں، مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے وہ ہر غم کو بھول جاتا اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے، اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشۂ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں، وحیِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادمانی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھنچ جائے۔

سامانِ جنت کے دنیاوی نام یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالم آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے، ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں،

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا (البقرہ: ۳)

اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ خوشخبری سنا کہ ان کیلئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ جب ان باغوں سے کوئی پھل دیئے جائیں گے کہیں گے کہ یہ ہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک طرح کے ملتا جلتا دیا جائیگا اور ان باغوں میں انکی صاف ستھری بیویاں ہونگی، اور ان باغوں میں رہا کریں گے، بےشبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بڑھ کر کم رتبہ کی چیز کی مثال بیان کرے۔

ان آیتوں کے سباق و سیاق اور نظم و ترتیب پر لحاظ کر کے ہر ذہن میں یہی معنی آتے ہیں، کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کے رو سے ان الفاظ کے دنیاوی لغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے، جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (سجدہ: ۲)

تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے انکے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

اس آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی لذت و راحت کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ جنت کی راحت و لذت کی حقیقت علم و فہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرما دیا ہے:

قال اللہ اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر[1]

خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ مہیا کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔

[1] صحیح بخاری، باب کلام الرب وتفسیر سورہ سجدہ، صحیح مسلم کتاب الجنۃ و ترمذی تفسیر سجدہ۔

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں، اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک "مخفی حقیقت" نہ فرماتا اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جنکو آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا اور نہ وہ کسی انسان کے خیال میں گذریں، مزید تاکید، روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے :

بلہ ما طلعتم علیہ (صحیح بخاری تفسیر سورہ سجدہ) جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو ۔

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں : بلہ ما اطلعکم اللہ علیہ، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ بلہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے" دوسرے یہ کہ خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگذر کرو"۔

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو اسکو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصح التفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے بسند نقل کیا ہے :

وقال السفیان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لا یشبہ شی مما فی الجنۃ مافی الدنیا الا فی الاسماء۔

سفیان ثوری، اعمش سے اور وہ ظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں،

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں :

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء[۱] جنت میں جو کچھ ہے، وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں،

غرض ان الفاظ سے ان ہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں، بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذتیں اور مسرتیں مراد ہیں جن کی تعبیر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسبت کے سبب سے انکو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے، اسمیں اشکال نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور ز دل ناخلیدہ مفاہیم کیلئے انکی زبان و لغت میں کوئی لفظ ہی نہیں،

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں یہ اصول بارہا بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں اور یا جنت کی مسرتیں دونوں اعمال انسانی کی تمثیلیں ہیں اسی لیے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے۔

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (طور : ۱۰) وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے ۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائیگا اے میرے بندو، یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل رہے ہیں، تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے ۔

مثلاً وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے تھے، ان کو جنت میں امن و سلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (طور : ۱) کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے تھے تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی، اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے بچا لیا

[۱] صحیح مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا [۲] تفسیر ابن جریر طبری آیت مذکورہ و بیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی تفسیر آیت مذکورہ،

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غضب سے ڈرتے تھے، وہ قیامت میں گرم لو (سموم) کے عذاب سے بچائے جائیں گے، قہر و غضب کی تمثیل شعلۂ آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غضب سے ترساں تھے، دیکھو کہ قیامت میں انکو سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی،

دولتمندی و قوی دست منکرین، غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے، قیامت میں اس کا الٹا ہو گا کہ یہ ان پر ہنسیں گے، فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ ۔۔۔۔۔ فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ (تطفیف : ۱) بیشک گنہگار، ایمان والوں پر ہنستے تھے ۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ تو آج ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے۔

نکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بنکر ظاہر ہوئی۔

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت و قوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل و عیال کیساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے، وہ یہاں غمگین ہوں گے، اور جو وہاں غمگین تھے، وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے۔

فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ۝ اِنَّهٗ کَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (انشقاق : ۱) تو وہ موت کو پکارے گا، اور دوزخ میں داخل ہوگا، کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال میں (مغرورانہ) خوش تھا،

اور جو نیکوکار وہاں اہل و عیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے ناآشنا تھا، اس کا یہ حال ہوگا کہ

فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۝ وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا (انشقاق : ۱) تو اس سے آسان حساب لیا جائیگا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔

قرآن پاک میں بار بار یہ آیتیں یا بعینہ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں:

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (بقرہ : ۲) اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اُن کو باغوں کی خوشخبری سنا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کیساتھ آتا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں، جن کی ترقی اور نشو و نما پانی سے ہوتی ہے، بعینہ اسیطرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے، اگر ایمان ہو اور اعمال صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشو و نما کی امید نہیں، اور اگر صرف عمل صالح ہے، اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود و عدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ ان باغوں میں داخل کیے گئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک

اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّھَا ط وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ہ (ابراھیم : ۴)

مثال بیان کی، نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہر وقت پھل لایا کرتا ہے، اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔

اس آیت میں جنت اور کلمۂ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب کہا گیا کہ اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے" تو دوسری میں ہے کہ وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا، کلمۂ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون صحابی کی وفات کے بعد انکی ایک ہمسایہ صحابیہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے، اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمانؓ بن مظعون کی ہے، انہوں نے آکر یہ خواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپؐ نے اسکی تعبیر میں فرمایا ذالک عملہ یجری لہ، یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو انکے لیے بہہ رہی ہے، (بخاری کتاب التعبیر)

ان دونوں سابق حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہروں سے ہے، اس بنا پر اہل جنت کے لیے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہونگی، ان کا ایمان خوشنما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمال صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جا سکتی ہے، علوم نبویؐ کے ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ حجۃ البالغہ میں لکھتے ہیں،

واکثر الوقائع الحشریۃ من ھذا القبیل ،.... وبالجملۃ فتشبحات وتشاوت لما عندھا.... وتشبح النعمۃ بطعم ھنی ومشرب مرییٔ ومنکح شھی وملبس رضی ومسکن بھی، (ص ۳۶ ، ھند)

حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں ،.... حاصل یہ کہ یہ تمام امورِ معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے.... اللہ تعالیٰ کی عنایت مہربانی خوش مزہ کھانے، خوش گوار پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذتِ نکاح، دلپسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔

ہم نے آیات و احادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا کہ اس تمثیل و تشبیہ کے کیا معنی ہیں، اور کیونکر غیر مجسم معانی، اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہو کر وجود پذیر ہوتے ہیں، دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو انکی لا محالہ دو قسمیں نکلیں گی، اور خدا پر ایمان اور خلوص دل سے اسکی اطاعت جسکو حقوق اللہ کہتے ہیں، اور دوسری بندگانِ الٰہی کیساتھ حسن سلوک، بندگانِ الٰہی کیساتھ جو نیک سلوک کیا جا سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں، اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریات زندگی یہی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں، ان ہی کی نسبت ہم ان کیساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں ان ہی پانچ قسموں پر منحصر ہیں، ایمان واخلاص و طاعت کی جزا تو خود اللہ تبارک تعالیٰ ہے، وہ اپنے قرب اور اپنے دیدار

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔

سے نوازے گا، عفت و عصمت کی جزا حسین و مہ جبین بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کو کھلانے کی جزا جنت کے باغ، درخت پھل اور قسم قسم کے الوانِ طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ و خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے، پہنانے کی جزا ریشم و حریر و دیبا و اطلس اور بہتر سے بہتر خوشنما لباس ہے اور رہنے اور بسانے میں حسنِ سلوک کی جزا خوش منظر مکان و قیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے،

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝ (طٰہٰ-۷)	بے شک تیرے لیے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا، نہ ننگا ہونا، اور نہ پیاسا ہونا، نہ دھوپ میں رہنا:

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہوگئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت نجات ملے گی، تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ پیاسا ہونا، نہ ننگا ہونا، نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کیجا سکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اسی لیے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا، نہ پیاسا اور نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوانِ نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا، اور پینے کے لیے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پھر پیاسا نہ ہوگا، اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے، اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گذر نہ ہوگا،

یہ اصول پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے، انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمالِ صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے، صبح کے نمازی کو خوابِ سحر کی لذت کو خیرباد کہنا، اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اس طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے،

انسان کو دنیا میں ان اعمالِ صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں، جن کا نام کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہے، اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب و مماثل جو چیزیں ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوانِ طعام، اقسامِ شراب و شربت، انواعِ لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآنِ پاک میں ہے:

فَأَمَّا مَن طَغَىٰ ۝ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ	بس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی کے ناجائز لطف و آرام کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز

هِيَ الْمَأْوٰى ۝ (نازعات:۲) خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی میں ہی اس کو ملے گی،

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط (آل عمران:۱۹) اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری دا کیجائے گی۔

لطف و مسرت کا تصور مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو، تو بالآخران کی انتہا ان ہی باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کردی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں، یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آسکتی ہیں، وہ یہی ہیں، باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور زر و جواہر، مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا، اور جب کبھی ہم انکو سمجھنا چاہیں گے، اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا، اور ہماری انسانی فطرت ان ہی مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے، اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے، اس لیے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی عادی و مانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گے، اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل اس دنیائے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں، ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنالینے پر قدرت نہیں، نتیجہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا ہے، تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور تخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (نحل:۴) رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان کیلئے اُن باغوں میں وہ ہے جو وہ چاہیں، اللہ اسیطرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔

وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حم السجدہ:۴) اور تمہارے لیے جنت میں وہ ہے جو تمہارے دل چاہیں، اور تمہارے لیے اس میں وہ ہے جو تم مانگو۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝ (ق:۳) انکے لیے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ (زخرف:۷) اور جنت میں وہ ہے جسکی دل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذت دے۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۝ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (فرقان:۲) ان کے لیے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہا کریں گے ہمیشہ یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط (زمر:۴) ان کیلئے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں گے۔

الغرض جنت وہ مقام ہے، جہاں ہم کو وہ کچھ ملیگا، جہاں تک ہمارا مرغ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند معیار جو تصور میں آسکتا ہے، وہاں ہمارے لیے مہیا ہوگا، صحابہؓ میں ہر قسم کے لوگ تھے، جنت کے سامانِ مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپؐ سے پوچھتے رہتے تھے، اور آپؐ جواب دیتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر، وہ کرے گا تو خدا فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب کچھ دیا گیا، جس کی تو نے آرزو کی تھی، اور اس کے برابر اور بھی[1] یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا، لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ وہاں کمی کسی چیز کی ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی، الا الصور من الرجال[2]

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور ہیر تیاری" یہ سب کام منٹوں میں انجام پا جائیگا، ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں گھوڑے بھی ہوں گے، فرمایا کہ اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تمکو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہوگا، دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اونٹ بھی ہوگا، فرمایا اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا، اور تمہاری آنکھیں پسند کریں گی،[3]

جنت میں اہلِ جنت کے مختلف رتبے ہونگے، اسلیے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دیا جائیگا (حتی یتخیل الیہ) کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لیے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں[4]،

جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں | کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے ؂

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کیساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو، یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہو جانیکا خوف ہے اور یا گذشتہ ناکامی کا افسوس ہے اس بنا پر یہاں کی کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا، جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی، اسمیں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں،

دنیا میں کوئی انسان اسوقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک اس کے سر کا پسینہ پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوششوں کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گذشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان کسی قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئیگا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا، اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک و احتشام

[1] صحیح مسلم [2] ترمذی، دیکھو مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ [3] صحیح بخاری [4] ترمذی [5] ترمذی، یہ کل حدیثیں مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ سے لی گئی ہیں،

اور لباس و زیور سے آراستہ ہوکر خدا کی حمد و تعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۨ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝ (فاطر: ۴)

رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہونگے انہیں وہ کنگن اور موتی پہنائے جائینگے اور انکی پوشاک انہیں ریشم ہوگی اور وہ کہیں گے پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا، بیشک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنیوالا ہے، اور نیکیوں کی قدر کرنیوالا، وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اُتارا اور ہم کو وہاں مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔

لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ۝ (حجر: ۴)

ان میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا، اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

جنت میں رشک و حسد نہیں موجودہ دنیا خیر و شر کے متضاد عناصر سے بنی ہے، یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم کیساتھ سنگدلی، محبت کیساتھ کینہ ہے، یہ گناہ و کینہ اور بغض و حسد، وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن و امان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلتا ہے، اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے اُبلتا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا، ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت، اور بغض و حسد کا خاتمہ ہوگا، اور خالص محبت و اُلفت کے دریا موجزن ہوں گے، فرمایا؛

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ (مریم: ۴)

اس میں امن و سلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے،

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ (اعراف: ۵)

اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ۝ (حجر: ۳)

اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا، نہ باہم بغض اور کینہ، سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے[1]،

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی، ان کی تعبیر الوان نعمت اور انواع شربت و شراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہوسکتی ہے مگر وہ حظ و مسرت اور اطمینان و سکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی، یہاں ہر کھانے پینے کیساتھ بول و براز، پسینہ اور سوء ہضم کی علت لگی ہوئی ہے، اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں کچھ نہ ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے، لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی، نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھکار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی، کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا، اسکو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہونگے، اور نہ انکی

[1] صحیح مسلم صفۃ الجنۃ

جوانی زائل ہوگی، وہاں منادی غیب یہ پکار کر کہہ دیگا، یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے اور وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوگے، اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح کوئی چودھویں کے چاند کی طرح"۔[1]

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی، ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی، اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا، مگر وہاں اس کی زندگی اسکی غذا، اسکے فضلہ، غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات وقوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے، اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا، اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کیساتھ سن کر آمادہ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگا، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر، اور اس عالم آب وگل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصول حیات، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے مادی وجسمانی خلقت وفطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا، اور یہ مادیت کی معراج ترقی ہے، جمادیت مٹ کر نباتیت پیدا ہوئی، اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی۔ پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے، ہنوز اپنے آغاز طفولیت میں ہے، کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے، ایک مادہ پرست صرف بام ارتقاء تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے، اور یہاں سے وہ اٹھ کر سقف آسمان تک پہنچتا ہے، اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (مومنون)

جو فردوس کی وراثت پائیں گے، اور وہ اسمیں سدا رہیں گے، اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا پھر اسکو (رحم انسانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا، پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا، پھر اس لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اسکو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا، تو برکت والا ہے سب سے بہتر بنانیوالا (خدا)

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچکر رک نہیں جائے گی، بلکہ آگے بھی ہوگی، اس لیے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زیست وحیات کے کچھ قواعد تھے، پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا، جہاں ترقی وحیات کے دوسرے ہی اصول ہیں اسی طرح اس دنیائے مادی سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا، جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

---

[1] یہ ساری حدیثیں صحیح مسلم صفۃ الجنۃ میں ہیں۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ (مومنون: ۱) — پھر بیشک تم اس کے بعد مرنے والے ہو، اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیت پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صدہا، ہزار ہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہوگا۔

یہاں مسئلہ ارتقاء کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو بقائے اصلح کہتے ہیں کہ ان مدارج ترقی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں، جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے، جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد ان ہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی و جسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی، دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز، جمادی و نباتی و حیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دار الامتحان میں اپنی کمی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کر سکیں۔

بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعداد والوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی ہی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا بلکہ وہ بقدرِ استعداد تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ط (تین: ۱) — ان (بہشتیوں) کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں اہلِ ایمان کے آگے پیچھے، داہنے بائیں نور ہوگا، پھر بھی دعا کریں گے،

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ج اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (تحریم: ۲) — ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑتے گا اور وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار، ہمارے نور کو کامل کر اور ہم کو معاف کر تو ہر بات کر سکتا ہے۔

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا، ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے، جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشا ہے۔

امن و سلامتی کا گھر انسان امن و سلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن و سلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے، اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے، اور وہ اس کو نہیں ملتا، لیکن یہاں اگر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن و سلامتی کی ایک دنیا ملے گی، وہ پرند جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحی محمدیؐ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دار السلام بھی بتایا ہے، جس کے معنی امن و سلامتی کے گھر کے ہیں۔

اہلِ جنت کی نسبت ارشاد ہے:

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ، (انعام: ۱۵) — ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے،

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے، وہ حقیقت میں اسی امن و سلامتی کی نوید و بشارت ہے، اس لیے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (یونس: ۳) — اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن و سلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلام ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا، وہ یہ تھی لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن و سلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔

جنت کے ذکر میں امن و سلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن و سلامتی کے ترانے سنائی دیں گے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد: ۳) — اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا تھا، تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔

وہاں امن و سلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دیگا۔

اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (واقعہ: ۱) — لیکن سلامتی سلامتی کی پکار،

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے،

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (ق: ۳) — اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا (مریم: ۴) — اس میں سلامتی کے سوا کوئی اور بیہودہ بات نہ سنیں گے۔

جنت کا ایک اور نام قرآن میں مقام امین "امن والا مقام" بتایا گیا ہے، فرمایا:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝ (دخان: ۳) — بے شک پرہیزگار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔

مقام رحمت خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آجاتے ہیں، جن کو ہم رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر و غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا، وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض و کرم کی بارش ہوگی، اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کبھی دکھائی نہ دے گا،

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ (توبہ: ۳) — ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ کا آرام ہے۔

اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے، یہ آواز سنائی دے گی،

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۱) — لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اس میں وہ سدا رہیں گے۔

مقامِ نور جنت کا نور وہ مقام ہے جہاں ظلمت و تاریکی کا نام ونشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا، اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان پر انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے داہنے بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا، فرمایا،

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (تحریم ۲)
ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔

اس دن اہل ایمان کے نور ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی،

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (حدید ۲)
جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا، آج تم کو خوشخبری ہو، وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہا کروگے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس دن اہل نفاق، اہل ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جائیے کہ ہمارا ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کیلئے روشنی ہو جائے،

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۔ (حدید ۲)
جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں،

مقامِ رضوان جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقام رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے راضی اور خوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا، متقیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں، ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ (توبہ: ۳)
ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے اور ان باغوں کی جن میں نعمت الٰہی قائم رہے گی۔

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا:

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (حدید: ۳)
اور آخرت میں سخت عذاب ہو، اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے، اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جسکا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے، یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے جو اللہ اور اسکے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جسکو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔

سورۂ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
جنہوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لیے ان کے پروردگار کے

28

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۔ (آل عمران: ۲)

پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں، اور اللہ کی خوشنودی۔

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوانِ الٰہی کو قرار دیا ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ (توبہ: ۹)

اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں سدا رہیں گے، اور رہنے کے ستھرے گھر اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے، وہی بڑی کامیابی ہے،

بہشت کی مطمئن روحوں کو یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے،

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ (فجر: ۱)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اسی طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے:

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (مائدہ: ۱۶)

خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش،

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت سنائی ہے کہ "خداوند تعالیٰ اہل جنت کو آواز دیگا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں، فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پا کر) اب تم خوش ہوئے، عرض کریں گے، پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائیگا کہ میں ان تمام گذشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے، فرمائیگا یہ کہ اپنی رضامندی و خوشی تم پر اتاروں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہونگا۔"

مقام طیب وطاہر موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے، لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا منظر ہے، اس میں وہی داخل ہونگے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا:

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ، (زمر: ۸)

تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ،

جو زندگی وہاں ملیگی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی و روحانی آلائش سے بری ہوگی، فرمایا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (نحل: ۱۳)

مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کیے ہم اس کو ایک پاک زندگی دیکر جلائیں گے، اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے، وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً، (صف: ۲) اور پاک گھر۔

جو بیویاں ملیں گی وہ بھی پاک ہوں گی،

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ، (آل عمران: ۲)

اور پاک بیویاں،

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی،

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ (حج: ۳)
اور اہلِ جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی،

ان کے پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی،

شَرَابًا طَهُوْرًا، (دہر: ۱)
پینے کی پاک چیز،

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک، صاف، طیب و طاہر اور تمام روحانی و جسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی،

مقامِ تسبیح و تہلیل | اس آرام و لطف کے بعد اہلِ جنت کی روحانی لذت، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوارِ الٰہی برسیں گے، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہوگا، جہاں قدس و نزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی، وہاں حمد و ثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے،

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (یونس: ۱)

جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی، اور ان کی آپس کی دعا، سلامتی ہوگی، اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح و تہلیل کی نئی نئی پُر لطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی، فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝ (حج: ۳)

بیشک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، انہیں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور انکی پوشاک ان میں ریشم کی ہوگی، اور وہ راہ دکھائے جائیں اچھی بات کی، اور وہ دکھائے جائیں گے، اس سراپا حمد (ذات) کی راہ،

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمد الٰہی کا سرودِ سرمدی گائیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب عالمِ وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا فرمایا:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاۤءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ وَتَرَى الْمَلٰۤئِكَةَ حَاۗفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (زمر: ۸)

جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے تو جنت میں چلے جاؤ، اہلِ جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں ہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور تو دیکھے گا کہ فرشتے عرشِ الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہونگے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائیگا اور کہاں جائیگا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔

اہلِ جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا وَلَھُمْ رِزْقُھُمْ فِیْھَا بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا، (مریم: ۴) — وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات، مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی،

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوان نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی، وہ تو ہر وقت سامنے ہونگے میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے؛ اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا:

یُسَبِّحُوْنَ اللّٰہَ بُکْرَۃً وَّعَشِیًّا (صفۃ الجنۃ) — وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اہلِ جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کرے گا اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں،

وَھُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَھُدُوْٓا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ، (حج: ۳) — اور اچھی بات کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔

مقامِ قرب اہلِ جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا، ان کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ، قرب خاص کا مقام ہوگا، بندہ اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جا بجا ان کے لیے یہ آتا ہے، جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ، ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس، یہ قرب خاص کے اشارے ہیں، اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے،

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَھَرٍ، فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ، (قمر: ۳) — بیشک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں میں سچائی کی نشست گاہ میں اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔

دیدار جنت کے سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلعِ انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی، یا وہ نورِ مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا، اور اہلِ جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی،

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ ط (قیامہ: ۱) — کتنے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبد اللہ صحابیؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے۔[1] دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے، اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا، اس تمثیل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مقصود ہیں، ایک تو شدتِ یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک و شبہ دیکھتے ہو اسی طرح بیشک و شبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جسطرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدارِ الٰہی میں کروڑوں کا جو ہجوم ہوگا اس میں خدا کے دیدار سے ایک دوسرے کا مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں، بلکہ جس دن جنتی

[1] صحیح بخاری جلد ثانی ص ۱۱۰۵؛

اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ (احزاب: ۶) ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے سلامتی ہوگی۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ (یٰسین: ۴) رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا۔

بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا خداوند تعالیٰ اپنے بندے سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا[^۱]۔

یہ روایت کیونکر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں، اہل عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہل حقیقت اس کو اسماء و صفات کی ناقابلِ بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے،

؎ بیا کیں داور یہارا بہ پیش داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گذر چکے یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے، اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہلِ عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مر کر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھا، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے، اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ قٓ تلاوت فرماتے تھے، جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم، قرآنِ پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف ان کا انکار اقرار سے بدل گیا، بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر ان کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہوگئے تھے، یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا۔

اموت ثم بعث ثم حشر حديث خرافة يا ام عمرو

کیا مرنا ہے، پھر جینا، اور پھر اکٹھا ہوتا اے عمرو کی ماں، یہ خرافات باتیں ہیں

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنزِ انکار، رمزِ یقین سے بدل گیا، اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا

"ہم آسمان تک پہنچ گئے، اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے ہو جائیں گے[^۲]۔"

وَاِنَّا لَنَرْجُوْ فَوْقَ ذٰلِكَ مَظْهَرًا اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے، عرض کرتا ہے کہ جنت یا رسول اللہ؟ آپؐ فرماتے ہیں ان شاء اللہ، دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں، ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا، جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے مواخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا، جن کو اپنے اعمال کی جوابدہی کی پروا نہ تھی، جو سزا و جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے، جو جنت و دوزخ کے تخیل سے ناآشنا تھے، وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے، دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آگیا جس طرح

[^۱]: صحیح بخاری ج ثانی باب کلام الرب
[^۲]: اصابہ و استیعاب ذکر نابغہ جعدی۔

آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے، اعمال کی جوابدہی سے ترساں و لرزاں رہنے لگے، سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی بازپرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشکبار کرتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کو دیانتداری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا معروفِ جدوجہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا، ان کے ضمیر اور دل کے صفحوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ کسی حقیقت کے متعلق دو صحابیوں میں جھگڑا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں فیصلہ دیدیا، پھر فرمایا میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو، جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں، لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو، تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں، یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا[1]۔

حضرت عمرؓ خدا کے مطیع و فرمانبردار تھے، رسولؐ کے عاشق اور شیدا تھے، نیکیوں سے مالامال تھے، جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے مواخذہ اور جوابدہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ "اگر وصالِ نبوی کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر برابر رہیں تو بھی میں خوش ہوں، اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں، مگر الٰہی دوزخ نہ ملے[2]، وہ نزع کی حالت میں بہت بے چین تھے، بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گنا کر انکو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا، خدا کی قسم اگر کل زمین میرے لیے سونا ہو جاتی کہ اس کو دیکر عذاب الٰہی سے بچ سکتا تو میں دیدیتا[3]۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کہتی تھیں، اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی[4]، اے کاش میں کچھ نہ ہوتی[5]۔

قیامت کے متعلق قرآنِ پاک کی یہ عجیب موثر آیت:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝ (حج:۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے جس دن اس کو دیکھو گے، ہر دودھ پلانیوالی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے، بلکہ خدا کا سخت عذاب ہوگا۔

جب اتری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ[6] بدل گیا اور

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ [2] صحیح بخاری باب الہجرۃ جلد اول ص ۵۵ [3] صحیح بخاری فضائل حضرت عمرؓ جلد اول ص ۵۲۱ [4] ابن سعد جزء النساء ص ۵۱ [5] صحیح بخاری مناقب عائشہؓ و تفسیر سورۂ نور و مستدرک حاکم ترجمہ عائشہؓ و ابن حنبل مسند عائشہؓ [6] صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج ج ۲ ص ۶۹۳۔

آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد کے عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار مار کر رونے لگے[1]۔ حضرت ابوہریرہؓ کو ایکبار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بیہوش ہو کر گرے، اور جب امیر معاویہ کے سامنے یہ آیت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا[2]۔

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدان جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈ آرہا ہے، ادھر تین سو تیرہ مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپؐ صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں "لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے"۔ ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپؐ فرماتے ہیں ہاں، وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں، آپؐ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا؟ عرض کی، اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں، فرمایا تم اس میں ہو، یہ سن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگا، بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گذرا، بولے اتنی دیر بھی کیوں کی جائے، یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچکر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

غزوۂ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، احد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کے پوچھا یا رسول اللہ! اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ فرمایا جنت میں، وہ کھجور کھا رہے تھے، ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دیدی، اور قیس ایک صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے، انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سائے کے نیچے ہیں، ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا اُس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے، انہوں نے کہا ہاں، یہ سُنکر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف میں جا پڑا اور شہادت[3] حاصل کی۔

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے منکر اور کافر عربوں کے دل و دماغ اور ذہن اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں ان کے عقائد و اخلاق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ حج [2] سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من القبر [3] جامع ترمذی ابواب الزہد
[4] یہ تینوں واقعے صحیح مسلم کتاب الجہاد باب ثبوت الجنۃ الشہید میں ہیں، دوسرا واقعہ سنن نسائی میں بھی ہے کتاب الجہاد باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ، ۱۲۔

قضا و قدر

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (قمر:۳)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا، مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے، چنانچہ بعض صحیح روایتوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے[1]، اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعتِ قدرت اور مشیتِ مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے، جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا، جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس کی تعمیر کو مکمل کرتے ہیں، اسی طرح مہندس ازل خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا۔ اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں، موت و حیات، فقر و غناء، کامیابی و ناکامی، تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیل تعلیم ہے۔

توراۃ میں حضرت آدم و شیطان اور ہابیل و قابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں، حضرت یوسف کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے مگر ان اشارات سے گذر کر زبور میں اس کی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے۔ زبور ۱۲۸-۱۴ میں ہے:

"تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرا جی کو بڑا یقین ہے، جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا، اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں، اور ان کے دنوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی"۔

اس کے بعد زبور ۱۴۸ کا ترانۂ حمد اسی لئے میں شروع ہوتا ہے۔

"..... خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا، اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے اس نے ان کو پائداری بخشی، اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔

انجیل میں اس کی تعلیم "خدا کی مرضی" کے عنوان سے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کی آخری شب کی دعا میں

---

[1] صحیح مسلم بروایت ابن عمرؓ و ابو ہریرہؓ باب الایمان۔

فرماتے ہیں، میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو (متی ۲۶-۳۹) اور اسی کا ذکر یوحنا (۵-۳۰-۶-۳۸) اور خطوط (فلپیون ۲-۱۳) میں ہے۔ اور رومیوں کے نویں باب میں اس کی پوری تفصیل ہے، مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح اور اس کی حکمت و مصلحت کی تشریح کی، اور پھر یہ کہا کہ گذشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کرلی، بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر کرلیا اور یہ تلقین یقین کی صورت میں ان کی رگ ریشہ میں پیوست ہوگئی، اور ایسا اس نے اس لیے کیا کہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے بلکہ عملی حیثیت سے اس کے پیرؤوں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حوادث میں تسلی و تشفی کی قوت پیدا کرے، اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کرلے،

وحیِ محمدیؐ نے اس اصطلاح کے لیے دو لفظ اختیار کیے ہیں، ایک قدر ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں، اور دوسرا قضا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں،

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (قمر ۳) — ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا (انعام ۱) — وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کردیتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے، کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرمادیا ہے اور متعین کردیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے، اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہوسکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمادیا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیے، موت و حیات، فنا و بقا، اور عروج و زوال، غرض کائنات کی ہر شق اور ہر پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرمادیے انہی پر وہ چل رہی ہے، قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (یٰسین ۳)

اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے، یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کردی ہے منزلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ) ہوکر لوٹ آتا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا (حم سجدہ ۲) — اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کردیں

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کردیا:

قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (طلاق ۲) — اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ بنایا ہے،

موت وحیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ، (واقعہ: ۲) ہم نے تمہارے درمیان موت کو اندازہ کر دیا،

ہر شے میں اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی ہے، جس کو لوگ قانونِ قدرت کہتے ہیں، اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام معین فرما دیے ہیں، جن کی اطاعت اس پر واجب ہے علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی و زوال، موت وحیات، بیماری و صحت، دولت و افلاس، آرام و تکلیف، سعادت و شقاوت ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرما دیے ہیں، غرض ان کو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے، خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے،

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ (تغابن: ۲) نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت لیکن اللہ کے حکم سے۔

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی، اس لیے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے، مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بدلتیں نہیں،

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ (فاطر: ۲)

اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی، اور نہ جنتی ہے، لیکن خدا کے علم سے، اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے لیکن کتاب میں، بیشک یہ اللہ پر آسان ہے۔

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا بچہ جنتی ہے وہ خدائے پاک کے علم سے ہے، دوسرا یہ کہ جس کو چھوٹی بڑی جو عمر بھی ملتی ہے، وہ کتاب الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں،

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا و قدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر و غرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے اس لیے وہ کبھی اپنے کیے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے، اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال اور صبر و ثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں، اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر و مسرت اور ناکامی کے افسوس و حسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دستگیری کرے، اور وہ یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے۔

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہِ راست نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس پر ہمارا فخر و غرور کرنا بیجا ہے، اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے، اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے، بلکہ اسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سرِ نو جد و جہد میں مصروف ہو جانا چاہیے،

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۚۖ لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ (حدید: ۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں، لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کھایا کرو، اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ نے مسئلہ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کے تائید کے لیے مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابۂ کرامؓ کی گردنیں عین کامیابی و فتوحات کی حالت میں خداوند قادر مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے، اور ان کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بیچارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی، کسی موقع پر وہ رحمت الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے، اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، اسی لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بہالے جاسکتے تھے اور نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ ۝ وَكَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (آل عمران: ۱۵)

کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مرسکے، یہ لکھا ہوا مقرر ہے، جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے، اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا، اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے، اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے، کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ وہ دل ہارے نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی، اور دون ہمتی نہیں، بلکہ بلندی، استقلال، اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، انکو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں کیونکہ،

لَنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا

ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (توبہ : ۷) لیے لکھدیا ہے وہ ہمارا آقا ہے اللہ پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لیے موت لکھی ہے وہ یا تو جنگ میں بھی مریں گے اور بستر راحت پر بھی، اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا، وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچکر نکل آئیں گے۔

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران : ۱۶)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے کہدے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جاچکا تھا وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر چلے جاتے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ (نساء : ۱۱)

تم جہاں بھی رہو تم کو موت آکر پالے گی اگرچہ تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں ہو۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل ہزیمت جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی، نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی، مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا، کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔

اب کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں، اور اس طرح یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں کہ اعملوا فکل میسر لما خلق (بخاری) لوگو اپنے اپنے کام کیے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے، اور یہ تقدیر ہے، فرمایا:

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝

بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رُخ کی ہیں تو جس نے دیا، اور پرہیزگاری کی، اور نیکی کو سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا، اور بے پروائی برتی اور نیکی کو جھٹلایا، تو ہم اس کو آہستہ آہستہ

وَمَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی ۝ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ وَالْاُوْلٰی ۝ (لیل: ۱) — سختی کی طرف لے چلیں گے، اور اس کی دولت اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی ہے، بیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے، اور آخر اور اول ہمارے لیے ہے۔

یہ ہے قضا و قدر اور سعی و عمل کی باہمی تطبیق، جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا، کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے، اور اس کے مطابق اس کی جزا دینا جو اس کام کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے، خدا کا کام ہے، نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستے کے دکھانے کا نام توفیق و ہدایت ہے، اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق و ہدایت کے نہ ملنے کا نام عدم توفیق و ضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے، خدا فرماتا ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا، (عنکبوت: ۷) — اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں،

خدا کی طرف سے توفیق و ضلالت کا ملنا، خود انسان کے اچھے یا برے عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔

وَمَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ (بقرہ: ۳) — اور ہم اس سے گمراہ نہیں کرتے لیکن انہی کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔

غرض پہلے فسق عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے،

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی، (نجم: ۳) — اور انسان کے لیے نہیں لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی، اور بیشک اسکی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی،

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے، اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو بامعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اسطرح دونوں کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر الٰہی اور عمل انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر و قدر عموماً لوگ اسی موقع پر جبر و قدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہیں یا مختار؟ حالانکہ یہ سررشتہ کائنات کا وہ عقدہ ہے، جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا، بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا، جس طرح اہلِ مذہب ارادۂ الٰہی اور ارادۂ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں، اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلم علم الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفۂ اخلاق والے، انسان کی آزادیٔ عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے بیچ میں جو تصادم ہے، اسکو بمشکل بچا سکے ہیں۔

دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا، ہر دھاگے میں یہ گرہ، اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں وہی انہوں نے نکالی تھیں، یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے، اور دبے پاؤں اس راستہ سے گذر جایا جائے، یا بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا، چنانچہ یہی جبر ہند و مذاہب میں تناسخ،

آواگون اور کرم کی صورت میں ہے، عیسائیوں میں حضرت آدمؑ کے گناہ اور خدا کی مرضی کے پیرایہ میں ہے،[1] اور یہودیوں کے مجموعۂ تورات میں حضرت ایوب کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے، دوسری طرف مجوسی تھے، جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا، خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پہلے مذاہب کی یہی نوعیتیں تھیں یعنی یا تو انکو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی، یا تھی تو خدا کی قدرت مطلقہ اور مشیت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا، یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے ہیں، یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے، جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں؛ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے، آسمان و زمین اور بر و بحر میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی، اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آجائے، جس کے اختیارات محدود، جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شاہنشاہی ناتمام ہو،

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی، مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے، اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے، اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے، جس طرح دوسری مخلوقات ہے تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت، یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام، اور برے کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے، بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تام حاصل ہے، اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو و کل پر حاوی ہے۔ اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے، نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا، اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے، اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا، اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا "اے خدا اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے، لیکن میری نہیں، بلکہ تیری مرضی پوری ہو"، عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانٹ کی کتاب الاسلام (ترجمہ عربی)، ص ۷۰ سے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے۔[2] شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل حافظ ابن قیم

بھی مواخذہ اور بازپرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیفۂ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے، اور ان کی تبلیغ کی ہے، ایک طرف وہ کہتا ہے کہ "خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی نہیں گر سکتا" اور دوسری طرف وہ کہتا ہے "ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے" یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابلِ رد مشیئت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیئت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ، اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضاء کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی، یہی ارادہ اور اعضاء کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت، اس کی ذمہ داری، تکلیف، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے، اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو، بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ) اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے، خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے، مگر ایک وقتِ مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اسکو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا، فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ (کہف: ۴)

تو جو چاہے مومن بن جائے، اور جو چاہے کافر ہو جائے۔

اس لیے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۔ (فصلت: ۶)

جس نے نیک کام کیا، تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لیے کیا، تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو، جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و برتر ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا یَعْقِلُوْنَ۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَلَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ۔ (یونس: ۵)

اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے، اور گو وہ سمجھتے نہ ہوں، اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤ گے، اور اگرچہ وہ نہ دیکھیں، بےشک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ ہی ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔

وہ انسان جو اندھا اور بہرہ بنتا ہے، اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے، خدا

اس کو اندھا اور بہرہ بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا، اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے، لوگوں کو قرآن کی ہدایت وضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکا ہوا ہے، حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ضلالت کی نسبت فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ:۱)

بیشک جنھوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا، ان کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہے، وہ ایمان نہ لائیں گے، خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور آنکھوں پر پردہ ہے۔

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا، تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا، اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں، کانوں پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ دیکھتے نہیں، دوسری جگہ فرمایا:

بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء:۲۲)

بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے، اور یہی خدا کی مہر ہے[1]۔

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیام حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق وہدایت سے سرفراز فرمائے، ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ (یونس:۱)

بیشک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد:۲)

اور جنہوں نے ہدایت قبول کی ان کو ہدایت میں اور بڑھا

ایرانی فلسفۂ خیر وشر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا ہے۔ حالانکہ عربی الفاظ خیر وشر کو اعمال کے خیر وشر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت ونعمت و آرام کے اور شر کے معنی غربت، تکلیف اور مصیبت ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ ان ہی معنوں میں آتے ہیں، البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا، تو عملِ خیر اور عمل شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا، جیسے:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (زلزال:۱)

جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا، وہ اس کو دیکھے گا، اور جو برائی کرے گا، وہ بھی دیکھے گا۔

اس لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں،

---

[1] قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے، وہاں اس کے کفر وفسق کی علت ہمیشہ ذکر کر دی گئی ہے، اس لیے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللہِ تَعَالٰی، اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔

کا یہ مطلب نہیں کہ انسانوں کے اچھے اور برے کام سب خدا کی طرف سے ہیں، بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج، مسرت و تکلیف، دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ان آیتوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ "اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا۔" اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے، جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے، حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے، الا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے، مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر، اور نیک یا بد، بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے

وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللہُ ۔ (دہر ۲) تم نہیں چاہو گے، الا یہ کہ خود خدا چاہے اور تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللہُ (انعام: ۱۳) وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں، الا یہ کہ خدا چاہے۔

وَلَوْ شَاءَ اللہُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (انعام: ۴) اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔

فَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (انعام: ۱۸) تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ خود ہدایت دیدیتا۔

وَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (نحل: ۱) اور اگر وہ خدا چاہتا، البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے اس لیے اس مشیت الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی، جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا:

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف ۴) تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے،

فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۔ (دہر ۲، مزمل ۱) تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کرلے۔

فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (نبا ۲) سو جو چاہے اپنے پروردگار کے پاس اپنا ٹھکانا بنا رکھے۔

اِلَّا مَنْ شَاءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (فرقان ۵) لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے مگر کن کے لیے، بتصریح فرمایا:

۱۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ (بقرہ: ۵) اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو،

۲۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللہُ قُلُوْبَهُمْ وَاللہُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (صف: ۱) جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا،

۳۔ بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (تطفیف) بلکہ ان کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے،

۴۔ بَلْ طَبَعَ اللہُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء ۲۲) بلکہ ان کے کفر کے سبب اللہ نے ان پر مہر کر دی۔

۵۔ اِنْصَرَفُوْا صَرَفَ اللہُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ (توبہ: ۱۶) وہ پھر گئے اللہ نے ان کے دلوں کو اس لیے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے:

۶۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (اعراف۔۱۳) اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔

۷۔ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (بقرہ: ۲) ان کے دلوں میں (پہلے سے نفاق کی) بیماری تھی، تو خدا نے بیماری بڑھا دی۔

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو، ہر ایک سے یہ صاف وصریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے، اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا موخر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر، اور بیماری کا اتر نا علت اور انسانوں کا کفر گناہ ونفاق معلول نہیں ہے، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، یعنی انسان کا فسق، کجی، زنگ، کفر، انصراف (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے، اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت وگمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے، اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے، اور غمگین ہوتا ہے، تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں، اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبط وحی ورسالت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث ومناقشہ سے منع فرمایا[۱] اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چٹکی کہ اس کی خوشبو اڑ گئی۔

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے،

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝ (فرقان: ۱) اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا۔

---

[۱] مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر۔

ایمان کے نتائج

گذشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اور دکھایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے، اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارع نے کیا مصلحتیں رکھی ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جاچکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہب اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ وہ بحثیں اصول کی تھیں یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے، وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں،

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں، اور نہ ہمارے نفس وضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے، یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا، ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح، تمامتر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا.

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہود نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم و رواج کو دی تھی، اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا دار و مدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط و ملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان اور نہ تنہا عمل پر، بلکہ ایمان صحیح اور عمل صالح کی جامعیت پر موقوف ہے، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا، بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت و سبب ہے، یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے،

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا، تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اُتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے، یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

(اے وہ لوگو! جو ایمان لائے) کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، اگر تم ایمان والے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات، ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے، اور وہی اس کے اہل سزاوار ہیں، فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ ۲:) ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ محبت الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے، ایک اور سورہ میں ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (نور ۷:)

ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب انکو فیصلہ کرنے کیلئے اللہ ورسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا، اور ان ہی لوگوں کا بھلا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات ۱:) ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں،

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران) اور خدا ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں،

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہل ایمان کی شان ہے، سورۂ مومنون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ .... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (مومنون ۱:)

بے شبہ اہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں، اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے، اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ..... اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے، نماز میں خشوع وخضوع، بے کام باتوں سے احتراز، زکوٰۃ وخیرات دینا، عفت وپاکدامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی، ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے، دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین وآخرین نشانی ہے، اور اسی لیے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اسی پر زور دیا گیا ہے،

ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں، ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات ونتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں، حافظ بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف موقعوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے، اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے

چھپ بھی گیا ہے، ایک حدیث میں ایمان کی شناخت، اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے، آپ نے فرمایا:

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا (سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ)

مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

حسنِ اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اسی ہستی سے ہونی چاہیے، جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، اور اس کے بعد اسی محبت الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا، جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہرِ ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں، فرمایا:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین (مسلم و بخاری کتاب الایمان)

تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان کامل نہیں، جب تک اس کے دل میں میری محبت، اس کی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت، پیار اور اخلاص ہو، جس طرح خود اپنے آپ سے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ اولجارہ ما یحب لنفسہ۔ (بخاری و مسلم کتاب الایمان)

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا ایمان اسوقت تک کامل نہیں، جبتک وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کیلئے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے،

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا، جب تک تم مومن نہ بنو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ بنو گے جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے، میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے؟ آپس میں سلام پھیلاؤ۔" (مسلم کتاب الایمان)

یہ محبت کسی نمائش، ریا یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو، فرمایا تین باتیں، جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پالیا، اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لیے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اسکے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہے، جتنا آگ میں ڈالا جانا۔" ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کامل اسلام کس مسلمان میں ہے، فرمایا، اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے"، فرمایا کہ ایمان کی ستر کچھ اوپر شاخیں ہیں، جن میں سے ایک شرم و حیا ہے" یہ بھی تعلیم دی کہ جس کو خدا اور آخرت کا ایمان ہو اس کو چاہیے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی، ورنہ چپ رہے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے" ایک صحابیؓ آپ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے،

یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے، یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے[1]۔

اس کے بالمقابل آپؐ نے متنبہ فرمایا کہ نفاق کی چار نشانیاں ہیں، جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے، اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے، اگرچہ وہ نماز گذار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے[2]۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے، اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے، وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے، اس تقریر سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں، اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے، اسی لیے اٰمَنُوْا کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے، بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے، جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا، اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے، اس بنا پر جہاں ایمان ہے، اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے چار سو تریپن صفحے سیاہ ہو چکے، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہرو قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقاء بھی کچھ دیر آرام کریں، ہر چند کہ

رہروان راخستگیِ راہ نیست عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

سلیمان ندوی

دار المصنفین ـــــ رمضان ۱۳۵۰ھ

وقد اعتنی بتصحیحہا وقد سعی فی تنقیحہ الاحقر المہین محمد محی الدین السواتی فاضل دیو

---

[1] یہ تمام روایتیں صحیحین کتاب الایمان میں ہیں۔ [2] صحیح بخاری کتاب الایمان بحث نظر مسلم ہے۔